اُردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

وحید شناسی

اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT
urdukutabkhanapk.blogspot.com

مرتب:
محمد طیب نعمانی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

اس کتاب کی
اشاعت میں
کسی بھی سرکاری،
غیر سرکاری ادارہ
یا کسی شخص کی
مالی معاونت
شامل نہیں ہے

انتساب

اماں
ابا
کی
شفقتوں
اور محبتوں
کے نام

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فہرست

اپنی بات	محمد طیب نعمانی	۷
وحید عرشی-ایک نظر میں	نغمہ پروین	۱۰
جن کے نقشِ پا پہ ہے ماہ و انجم کا گماں	ہمدم نعمانی	۱۱
روبرو-خرم جہاں اہلیہ وحید عرشی سے ایک ملاقات	محمد طیب نعمانی	۱۲
مضامین		
وحید عرشی: تم کیا گئے کہ...............	پروفیسر شاہد اختر	۱۶
زنجیر کھینچ کر وہ مسافر اتر گیا	منور رانا	۲۱
وحید عرشی کی شاعری-ایک سرسری جائزہ	حیدر صفت	۲۷
وحید عرشی بحیثیت نثر نگار	زماں قاسمی	۳۰
یادوں کا زنداں	کمال جعفری	۳۴
وحید عرشی	جاوید ارشد چودھری	۳۷
خواب اور حقیقت کے درمیان کا شاعر	محمد شمشیر عالم	۳۹
ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے	زماں قاسمی	۴۵
وحید عرشی-جستجو آشنا شاعر	احمد وکیل علیمی	۵۱
غمِ حیات کا شاعر-وحید عرشی	محمد ایوب انصاری	۵۴
ایک ہشت پہل ہیرا	ہمدم نعمانی	۶۰
وحید عرشی-کچھ یادیں	محمد شمس الزماں انصاری	۶۵
سپنا ہی تھا ٹوٹ گیا	ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی	۶۸
بلیغ فکر کا شاعر-وحید عرشی	ڈاکٹر افضال عاقل	۷۳
یادوں کی بازیافت کا شاعر	معید رشیدی	۷۸

منظوم خراجِ عقیدت:		
قطعہ بر وفات وحید عرشی	ابراہیم ناشاد	۸۵
غزل	دل عرفانی	۸۶
قطعات	زماں قاسمی	۸۷
اداکار	نور اقبال	۸۸
مختصر آراء:		
صلیبِ زیست کا شاعر	مظہر امام	۹۰
ایک خوش فکر شاعر	معین اعجاز	۹۱
وحید عرشی	پروفیسر مشتاق احمد	۹۲
آہ وحید عرشی	معصوم شرقی	۹۳
ایسے کھوئے پھر نہ پائے گئے	قیوم بدر	۹۴
تخلیقات وحید عرشی		
آکاش پتر (تحقیقی مضمون)		۹۵
بجھے لمحوں کی یاد (وکیل اختر کی یاد میں)		۱۰۵
لاش (افسانہ)		۱۱۰
منتخب غزلیں		۱۱۳
منتخب نظمیں		۱۲۰
حوالہ جات		۱۳۶
قلم کاروں کا مختصر تعارف		۱۳۷
وحید عرشی کی تصاویر اور دستکاری کے نمونے		۱۳۹

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اپنی بات

''وحید شناسی'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ زمانۂ طالب علمی سے میں وحید عرشی کا نام سنتا آرہا تھا۔ گھر کی لائبریری میں پرانے ادبی رسالوں کی ورق گردانی کرتے وقت ایک پرچہ صدف ۱۹۸۷ء ہاتھ لگا جس میں ''آہ! وحید عرشی'' عنوان پر نظریں جم گئیں۔ اس مختصر سی تحریری نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اتنی کم عمری میں ایسا سانحہ۔ جب طبیعت کو ذرا سکوں حاصل ہوا تو وحید صاحب کے تعلق سے میرے اندر تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہو چکی تھی۔

واقعی مرحوم کی شخصیت ایک ایسے لیـــجـــنـــڈ کی ہے جس کا مطالعہ ضروری ہے اور یہی تجسس وحیدیات کے مطالعہ کا باعث بنا۔ اسی درمیان ۱۹۹۱ء میں کمال جعفری کی مرتب کردہ کتاب ''یادوں کا زنداں'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ کمال صاحب نے وحید عرشی کو ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ کتاب پڑھ کر میری تسلی نہیں ہوئی۔ لہٰذا میں نے اپنے طور پر وحید صاحب کی تلاش و جستجو میں لگ گیا۔ لائبریریوں کی خاک چھانی۔ فائلوں' رسالوں کو کھنگالا' اخبارات کے اوراق الٹے۔ کچھ سینئر لوگوں سے گاہے گاہے گفتگو کرتا رہا۔ اس طرح مجھ پر انکشاف ہوا کہ وحید صاحب کی شخصیت ایک ایسے فنکار کی ہے کہ ان سے متعلق بہت سارے گوشے پردۂ خفا میں ہیں۔ ان پر بھرپور روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ لہٰذا میں نے تہیہ کرلیا کہ وحید عرشی سے متعلق تمام مواد کو اکٹھا کروں گا اور دلجمعی کے ساتھ اس کام میں لگ جاؤں گا۔ یہاں تین اشخاص قابلِ ذکر ہیں جن کی وجہ سے مواد کی فراہمی میں سہولت پیدا ہوئی۔ ایک میرے خسر محترم زماں قاسمی جن کا تعلق کانکی نارہ کی سرزمین سے ہے اور جن کے تعلقات مرحوم وحید عرشی کے بڑے بھائی خواجہ مجیب الحق سے بہت گہرے تھے۔ دونوں چھٹیوں میں شطرنج کی بساط پر جمے رہتے تھے۔

دوسرے میرے برادر کبیر جناب ہمدم نعمانی جن کا ادبی مطالعہ کافی وسیع ہے۔ ادبی دنیا میں ان کا بڑا نام ہے۔ کئی اہم مواد کے سراغ ان سے ملے اور تیسرے ڈاکٹر الماس شیخ جو مٹیا برج ہری موہن گھوش کالج کے پروفیسر اور میرے خاص دوستوں میں ہیں۔ ان تینوں حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر محترمہ خرم جہاں (اہلیہ وحید عرشی) کا شکریہ نہ ادا کیا جائے۔ محترمہ نے انٹرویو کے لئے اپنا قیمتی وقت دیا اور نہ صرف وحید صاحب کے متعلق معلومات افزا انکشافات کیے بلکہ مرحوم کی باقیات (تصاویر' آرٹ کے کچھ نمونے) جو انہوں نے ایک لائق و فائق امین کی طرح سنبھال کر رکھا تھا میرے حوالے کیا۔ آپ اس کتاب میں مرحوم وحید عرشی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی تصویریں' آرٹ کے وہ نمونے' مجسمے' کچھ نادر مواقع کی جھلکیاں دیکھ سکیں گے۔ دوران ملاقات انہوں نے وحید صاحب کی رحلت کے بعد صبر آزما حالات' ان سے نپٹنے کی ہمت اور کوشش کا بھی تذکرہ کیا۔

کمال جعفری کی کتاب ''یادوں کا زنداں'' مرحوم وحید عرشی کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کرتی ہے مگر کتاب کے مطالعہ کے آپ پر منکشف ہوگا کہ مرحوم وحید عرشی شاعر کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ایک کامیاب محقق جو نہایت ہی ذمہ داری کے ساتھ اپنے بزرگوں کے حوالے سے ایک تاریخ رقم کر گیا تاکہ آنے والی نسل اس کی روشنی میں اپنا عملی قدم مضبوطی سے جما سکے۔ ''آکاش پتر'' پڑھنے کے بعد آپ ضرور میری باتوں سے اتفاق کریں گے کہ مغربی بنگال کی روایتی تہذیب' رکھ رکھاؤ' پھر بیرون بنگال سے تلاش روزگار میں آکر بسنے والے وہ افراد جنہوں نے دریائے ہگلی کے دونوں کنارے کی صنعتی پٹیوں کو اپنی قوت اور محنت کے پسینے سے آباد کیا اور رہائش سے لے کر تہذیب و ترقی کے باب میں اپنا نام اور اپنا حصہ محفوظ کرلیا۔ مگر یہاں کے کچھ متعصب افراد نے لسانی جہالت کا اظہار کرتے ہوئے ''سن آف دی سوائل'' کی ضد کو آکاش پتر بنا دیا۔ افسانہ لاش میں وہی فرقہ وارانہ فضا موجود ہے جس کی آگ میں پورا ملک جھلستا رہا ہے اور اکثر جس کی شروعات غلط فہمی پر ہوتی ہے اور ہم ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر سچائی پھر بھی سچائی ہے چاہے لاکھوں من لوہے کے نیچے دبی رہے یا کچھ لوگ مصلحت کی آڑ لے کر گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے رہیں۔

وحید شناسی میں آپ وحید عرشی کی کچھ ایسی غزلیں/نظمیں پڑھیں گے جو اس سے قبل شائع نہیں ہوئی ہیں۔ نثر کا بھی یہی حال ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ کمال جعفری نے یادوں کے زنداں میں صرف نظموں اور غزلوں پر اکتفا کرلیا تھا۔ اس کتاب میں نثر نگاری کی حیثیت سے مرحوم کے نثر پارے پہلی بار ایک جگہ آپ پڑھ پائیں گے۔

اس سلسلے میں ہم ان تمام قلم کاروں کے مشکور ہیں جنہوں نے وحید عرشی پر مضمون لکھا۔ وہ محترم شعرائے کرام جنہوں نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا اور اظہار تعزیت کا حق ادا کیا۔ مسودے پر نظر ثانی کے لئے میں اپنی شریک حیات نغمہ پروین (جو اس وقت کلکتہ کے معروف سی ایم او ہائی

اسکول کے پرائمری سیکشن میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں) کا ممنون ہوں۔ان کا پرخلوص تعاون شاہ راہ زندگی کے ہر موڑ پر مجھے حاصل رہا ہے۔

محترم عنبر شمیم نے جس طرح سے میری پذیرائی کی میرے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے مواد کی کمپوزنگ سے ڈیزائننگ اور کاغذ کی خریداری سے لے کر طباعت جیسے دشوار کن مراحل کا ذمہ اپنے سر لیتے ہوئے میرے لئے آسانیاں فراہم کیں۔

محمد طیب نعمانی

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

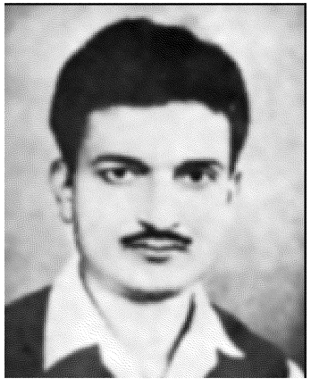

وحید عرشی ایک نظر میں

ترتیب:..نغمہ پروین

نام	:	خواجہ وحید الحق
قلمی نام	:	وحید عرشی
والد کا نام	:	مولوی محمد حنیف
والدہ کا نام	:	زبیدہ خاتون (بنت مولانا محمد یعقوب)
پیدائش مقام	:	۲۷ دسمبر ۱۹۴۳ء نرائن پور بھاٹ پاڑہ (ضلع ۲۴ پرگنہ)
تعلیمی صلاحیت	:	ایم اے (اردو) گولڈ مڈلسٹ (کلکتہ یونیورسٹی)
رفیقہ حیات	:	خرم جہاں
اولادیں	:	(۱) خواجہ دانش اریب (۲) خواجہ یاسر ہمیش (۳) شاذیہ وحید
ملازمت	:	(۱) حمایت الغرباء ہائی اسکول (کانکی نارہ) (۲) بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی (کلکتہ)
تصنیف	:	یادوں کا زنداں ۱۹۹۱ء (مرتبہ: کمال جعفری)
وفات	:	۳ فروری ۱۹۸۶ء

پسِ نوشت: مغربی بنگال میں اردو (آزادی کے بعد) میں جاوید ارشد چودھری نے تاریخِ ولادت ۲۷ ستمبر درج کیا ہے جو درست نہیں ہے۔حوالے کے لیے بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء اور یادوں کا زنداں ملاحظہ فرمائیں۔ نیز محترمہ خرم جہاں اہلیہ وحید عرشی نے بھی ۲۷ دسمبر ۱۹۴۳ء کی تصدیق کی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وحید عرشی

جن کے نقشِ پا پہ ہے ماہ و انجم کا گمان

ہمدم نعمانی

سر پر سلیقے سے سنورے بال، آنکھوں میں ہنگامۂ فردا کا اندمال، ستواں ناک، رمزِ حیات کا ادراک، ہونٹ لعلِ بدخشاں کی طرح لال، پان کی سرخی سے مالا مال، پان اس لئے کھانا کہ حالات کی کڑواہٹ کو چبا جانا، مسکراہٹ فقیروں جیسی، دوستوں سے ریاکاری کیسی۔ لہجے میں انکساری کی خوشبو، شانِ دلبری سے لبریز گفتگو۔ جائے پیدائش کانکی نارہ جسے برادرِ کبیر خواجہ مجیب الحق نے سلیقے سے سنوارا۔ ۱۹۶۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کر کے گولڈ میڈل کے حقدار ہوئے، اب اردو کے سپہ سالار ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں حمایت الغرباء ہائی اسکول میں طلبہ کے معلم و دمساز ہوئے۔ ایک لائق مدرس کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں گھر سے چالیس کلومیٹر دور بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی میں شمعِ اردو جلانے لگے۔ وہاں پر بھی پروانۂ علم منڈلانے لگے۔ اب ادبی مجلسوں میں شمولیت ہونے لگی۔ دنیائے ادب میں مقبولیت ہونے لگی۔ مشاعرے میں مترنم آواز کے زیر و بم سے مسرور کرتے، سامعین کو ارضِ بنگالہ کے سحر سے مسحور کرتے۔ مکرر ارشاد کی صدائیں فضا میں بلند ہو جاتی۔ گویا غزلوں کی اہمیت دوچند ہو جاتی۔ اب ذاتِ گرامی شہرت و ناموری کی طرف گامزن ہوئی، شخصیت فرد سے انجمن ہوئی، نثر نگاری اور افسانہ نگاری پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اشہبِ قلم کو مہمیز کیا اور ان اصناف کو بھی ارتقاء سے انگیز کیا۔ ان تمام سرگرمیوں کے باوجود خود کو کبھی بھی ڈیکوریٹ نہیں کیا اور نہ ہی اپ ڈیٹ کیا۔ خوددار طبیعت نے دستِ طلب کو دبائے رکھا، جوہرِ بالغ نظری نے اپنی جنس بے بہا کو چھپائے رکھا۔ انہیں تو بس لکھنے پڑھنے کا جنون تھا، یہی ان کا فسون تھا۔ کچھ اہم ادبی تصانیف کا بیڑا اٹھایا تھا، مگر ان پر مالی دشواریوں کا سایہ تھا۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ کتابیں چھپ جائیں اور منصۂ شہود پر آجائیں۔ جواں مرگی کا مرثیہ ضرور پڑھا جائے لیکن مرحوم کی تصانیف پر غور و فکر کے بعد مزید لکھا جائے۔ یہی سچی خراجِ عقیدت بھی ہے اور فی زمانہ ضرورت بھی ہے۔

رو برو

محترمہ خرم جہاں (اہلیہ وحید عرشی مرحوم) سے ایک ملاقات

ملاقاتی: محمد طیب نعمانی

جون ۲۰۱۱ء کے آخری ہفتہ میں محترمہ خرم جہاں (اہلیہ وحید عرشی مرحوم) سے لیا گیا انٹرویو کافی اہمیت کا حامل ہے ایک طرف یہ انٹرویو وحید عرشی کے مخفی گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے تو دوسری جانب ان کی اہلیہ محترمہ خرم جہاں کی بلند حوصلگی، جاں فشانی، جد و جہد اپنوں کی بے اعتنائی، نام نہاد دوستوں کے سلوک کو بھی آشکار کرتا ہے۔ مرحوم کے انتقال کے بعد بحیثیت ماں، انہوں نے جس طرح نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔ اپنے جگر گوشوں کی پرورش و پرداخت اور کردار سازی کی کہ آج ان کا بڑا بیٹا خواجہ دانش اریب مٹیابرج کے ایک سرکاری پرائمری اسکول میں ایک کامیاب مدرس ہے۔ دوسرا بیٹا خواجہ یاسر ہمیش H.S.B.C ہانگ کانگ شنگھائی بینکنگ کارپوریشن میں Quality Analyst ہے اور بیٹی شاذیہ وحید جامعہ ملیہ دہلی سے پولیٹیکل سائنس میں M.Phil کرنے کے بعد جامعہ ہمدرد دہلی سے Ph.D کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ موصوفہ نے خود کو بھی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا اور فی الحال حکومت مغربی بنگال کے شعبۂ اطلاعات و نشریات سے وابستہ ہیں اور رسالہ ''مغربی بنگال'' کی نائب مدیر کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ کلکتہ کے سالٹ لیک جیسے Posh علاقے میں قیام پذیر ہیں۔

طیب نعمانی: خواجہ وحید الحق صاحب جو وحید عرشی کے نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہیں، سے آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟

خرم جہاں: ہماری شادی ۱۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو ہوئی تھی۔

طیب نعمانی: وحید عرشی صاحب کی اہلیہ ہونے کے ناطے آپ نے انہیں بہت سے قریب دیکھا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ آپ سے زیادہ قریب سے انہیں کسی اور نے نہیں دیکھا ہوگا۔ میرا سوال یہ ہے کہ بحیثیت انسان اور شوہر آپ نے انھیں کیسا پایا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خرم جہاں: خوش قسمت ہوں کہ میں ان کی بیوی اور وہ میرے شوہر تھے۔ لیکن میری بدقسمتی تھی کہ میرا ان کا ساتھ بہت دنوں کا نہیں رہ سکا۔ وہ اچھے انسان تھے۔ ایک مثالی شوہر اور ایک نیک انسان میں جس طرح کی خوبیاں ہونی چاہئے وہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم ان میں موجود تھیں۔ وہ اپنے سماج' اپنی زبان' اپنے خاندان اور اپنے بچوں سے بیحد پیار کرتے تھے۔

طیب نعمانی: آپ کے کتنے بچے ہیں اور ابھی وہ کیا کر رہے ہیں؟

خرم جہاں: ہماری تین اولادیں ہیں۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا خواجہ دانش اریب مٹیا برج کے مولانا آزاد پرائمری اسکول میں معلم ہے۔ دوسرا بیٹا خواجہ یاسر ہمیش H.S.B.C بینک میں Quality Analyst کے عہدے پر فائز ہے۔ بیٹی شاذیہ وحید جامعہ ملیہ دہلی سے پالیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے کے بعد انٹر اسٹیٹ ریلیشن اِن انڈیا کے موضوع پر ایم۔فل مکمل کر چکی ہے۔ شاذیہ ان دنوں جامعہ ملیہ دہلی سے پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔

طیب نعمانی: ماشاء اللہ اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت میں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جب وحید عرشی صاحب کا انتقال ہوا اس وقت یہ بچے کافی چھوٹے ہوں گے۔ آپ نے سماجی اور معاشی حالات کا مقابلہ کیسے کیا۔ کچھ بتائیں گی؟

خرم جہاں: بس اللہ کا کرم ہے کہ ہمیں ان پریشانیوں پر قابو پانے میں کامیابی ملی۔ وحید صاحب کا خلا تو ہماری زندگی میں کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔ آج بھی کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب ہم ان کا ذکر نہیں کرتے۔ جب ان کا انتقال ہوا تھا تو میرا بڑا بیٹا دانش صرف پانچ سال کا تھا۔ اسے اپنے ابو سے متعلق آج بھی بہت سی باتیں یاد ہیں لیکن یاسر اور شاذیہ کو تو کچھ بھی یاد نہیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں بچے اپنے والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ میری تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ یقین مانیں میری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ زندگی میں تو وہ بہتوں کے دوست رہے لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کوئی دوست سامنے نہیں تھا۔ سب کے سب لمحاتی ہمدرد تھے۔ یہاں میں ایک صاحب کا ذکر کرنا چاہوں گی۔ دوا علاج کے سلسلے میں انہوں نے کافی دوڑ دھوپ کی تھی۔ نام شاید منیر احمد تھا۔

جب کچھ ہوش آیا تو پہلے خود کو سنبھالا۔ اب بچوں کی فکر دامن گیر ہوئی۔ معاشی زندگی کو سر کرنے کی تگ و دو شروع ہوئی لیکن راستہ انتہائی پرخار۔ جگہ جگہ آلام و مصائب کے پہاڑ کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا وہ کیا گئے کہ تمام راستے مسدود ہو گئے۔ میں کوئی ملازمت کرنا چاہتی تھی تاکہ معاشی تنگی کا کچھ تو ازالہ ہو سکے لیکن صرف ہائر سکنڈری کی بنیاد پر کوئی اچھی ملازمت کا ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس بے سرو

سامانی اور پریشانی کے عالم میں ابا ہمیں کانکی نارہ سے اپنے گھر تالتلہ لین لے آئے۔ اس کے بعد میں نے بچوں کی خاطر ۱۹۸۷ء میں لیڈی برابورن کالج میں داخلہ لیا۔ اردو آنرس کے ساتھ بی اے پاس کیا اور تب ۱۹۹۱ء میں مجھے ملازمت ملی۔ اس کے بعد پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے میں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئی۔

طیب نعمانی: وحید عرشی صاحب کے انتقال کے بعد خود کو Stable کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی اچھی تعلیم سے سنوارا' یوں کہئے کہ پھول جیسے بچوں کو بادسموم کے جھونکوں سے بچا کر پرورش کرنا' تعلیم و تربیت سے نکھارنا یہ سب کیسے ممکن ہو سکا؟

خرم جہاں: کانکی نارہ میں رہ کر اتنا سب کچھ کرنا میرے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ کیوں کہ میں وہاں کی بہو تھی اور بہو ہونے کے سبب پردہ میں رہنا بھی ضروری تھا۔ اس وقت بچے بہت چھوٹے تھے۔ اگر بچے گھر سے باہر چلے جاتے تو ان کو ڈھونڈ کر لانا میرے لئے انتہائی مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ بھیا ہوتے تو اور بات تھی (یہاں بھیا سے مراد وحید عرشی کے بڑے بھائی پروفیسر مجیب الحق ہیں جن کا انتقال اور پہلے ہو چکا تھا)۔

اس کے علاوہ معاشی تنگی کے سبب ہماری حالت انتہائی دگرگوں تھی۔ ان پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے میرے ابا (پروفیسر عبدالرؤف) ہم لوگوں کو اپنے گھر لے آئے۔ میں بحالت مجبوری سسرال چھوڑ کر میکے آ گئی۔ اس کے لئے سب سے پہلے اللہ کی شکر گزار ہوں کہ حالات کو سازگار بنانے میں اس کا کرم شامل رہا۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں اس کا اعتراف کرنے میں فخر محسوس کرتی ہوں کہ اللہ کے بعد جو دست شفقت میرے سر پر رہا وہ میرے ابا کا تھا۔ مجھے ان پر فخر ہے۔

طیب نعمانی: دورانِ گفتگو آپ نے بتایا ہے کہ گریجویشن کرنے کے بعد ہی آپ کو ملازمت مل گئی تھی۔ آپ کہاں ملازمت کرتی ہیں؟

خرم جہاں: ہاں! درمیان میں یہ بات رہ گئی۔ ۱۹۹۰ء میں اردو آنرس کرنے کے بعد ہی ۱۹۹۱ء میں شعبۂ اطلاعات ونشریات (رائٹرس بلڈنگ) میں بحیثیت اردو پروف ریڈر کے میری بحالی ہوئی۔ فی الحال ترقی کر کے حکومت مغربی کے ماہانہ رسالہ ''مغربی بنگال'' میں سب ایڈیٹر کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہوں۔

طیب نعمانی: وحید عرشی صاحب اپنی ملازمت کے دوران معاشی تنگی سے دوچار تھے۔ اس کا اظہار مایوسی' جھلاہٹ یا کسی اور شکل میں آپ کے سامنے ہوا؟ وہ کبھی دلبرداشتہ نظر آئے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خرم جہاں: جی نہیں! قطعی نہیں! وہ جہد مسلسل کے قائل تھے۔ صبح تڑکے گھر سے نکل جاتے۔ بھوانی پور کالج (کلکتہ) میں کلاس لیتے۔ دن بھر سرکاری دفتروں کے چکر لگاتے۔ وہ اپنی ملازمت کو لے کر کافی فکرمند تھے۔ انتہائی کوشش کی کہ Permanent ہو جائیں لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شام کو تھک کر گھر آتے دوسری صبح پھر زندگی کی لڑائی لڑنے کے لئے تیار ہو کر گھر سے نکل پڑتے۔ اس دوڑ دھوپ کی زندگی کی انہوں نے ایک تصویر بنائی تھی جس کی شکل خرگوش سے ملتی جلتی ہے۔ وہ میں آپ کو دے رہی ہوں۔ اس سے پتہ چل جائے گا کہ اس تگ و دو کی سرحدیں کہاں کہاں تھیں۔

طیب نعمانی: اب آخری سوال۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں مایوسی یا پریشانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

خرم جہاں: ان کے کلام میں مایوسی کی جھلک نہیں بلکہ اس کی تہہ میں ایک عزم و حوصلہ صاف جھلکتا ہے۔ ویسے بھی وہ جن پریشانیوں سے نبرد آزما تھے اس کا اثر تو ان کے کلام پر پڑنا ہی تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے اشعار میں گھریلو معاشی پریشانیوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ سب کے سامنے اپنے دکھوں کا پٹارہ کھولنا انہیں پسند نہیں تھا۔

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

وحید عرشی: تم کیا گئے کہ............

..................................پروفیسر شاہد اختر (ایم اے)' شعبۂ اُردو (ہگلی محسن کالج)

وہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ تیلنی پاڑہ راجہ بازار کے مشاعرہ میں خواجہ وحید الحق وحید کو نقیبِ مشاعرہ نے آواز دی اور ایک خوب صورت جسم اپنی حسین آواز کے ساتھ غزل سرا ہوا۔

شیخ جی ہی نہ پی رہے ہوں کہیں
میکدے کا چراغ مدھم ہے

آواز کے اس جادو نے بہت دنوں تک مجھے اپنا اسیر بنائے رکھا تب میرے لئے شعر سے زیادہ ترنم ہی متاثر ہوا کرتا تھا۔ باشعور ہوا تو حمایت الغرباء ہائر سکنڈری کے درجہ دہم میں داخلہ کی غرض سے بھائی کمال الدین کمالؔ کا تعارفی خط لے کر جب کانکی نارہ نیا بازار پہنچا تو اس شخصیت کو اپنے روبرو دیکھا۔ بچپن سے جس کی آواز کا اسیر تھا۔

''اچھا تو تم کمال بھائی کے بھائی ہو''۔

''جی''!

''چائے پیو''۔

''جی شکریہ''۔

''شاعری کرتے ہو''؟

''نہیں تو''۔

''تو پھر شاعروں کے انداز میں تکلف کیوں کرتے ہو''۔

اس پہلی ملاقات میں خواجہ وحید الحق وحیدؔ نے' جواب وحیدؔ عرشی بن چکے تھے۔ مجھے بے تکلف کر دیا۔ پھر حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول میں دو سال ان کی شاگردی میں رہ کر ہم استاذ شاگرد کے روایتی رشتوں سے آزاد ہو گئے۔ میں ان کا شاگرد تھا۔ چھوٹا بھائی تھا۔ دوست تھا یا غمگسار۔ میں خود یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ میرا ان سے صحیح رشتہ کیا تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

’’شاہد تم نے فلم سکینہ مہتو دیکھی ہے‘‘؟

’’نہیں سر‘‘۔

’’پہلی فرصت میں دیکھ ڈالو‘‘۔

’’کیا خاص بات ہے سر‘‘؟

’’تمہارے اندر کے انقلابی کو سکون ملے گا‘‘۔

’’شاہد تم شاعری مت کرو‘‘۔

’’کیوں سر!‘‘

’’تم وحید عرشی نہیں بن سکتے‘‘۔

’’سر میں نے آپ کی ہمسری کا خواب کب دیکھا ہے‘‘۔

’’بیوقوف ہو۔ شعر کہو تو غالبؔ کی تمناؤں کی امید رکھو۔ جب تم وحیدؔ نہیں بن سکتے تو غالبؔ کیا بنو گے‘‘۔

’’چلیئے شعر نہیں کہوں گا‘‘۔

’’سنو! ہمارے یہاں نثر نگاروں کی سخت قلت ہے تم نثر لکھو‘‘۔

’’سر میں مولانا آزاد نہیں بن سکتا‘‘۔

’’مولانا آزاد نہیں بن سکے تو کم از کم اُردو ادب کو ایک نثر نگار تو دے سکو گے۔ ہمارے ادب کو اب شاعروں کی ضرورت نہیں‘‘۔

’’کہو کیا بات ہے‘‘۔

’’سر وہ لکڑی کے کندے پر ٹیگور جو تراش رہے تھے اس کا کیا بنا‘‘؟

’’کیوں میاں! تمہیں میری فنکاری پر شک ہے‘‘؟

’’نہیں سر میں تو آپ کو بہت بڑا فنکار سمجھتا ہوں‘‘۔

’’شاباش! اسی طرح حق شاگردی ادا کیا کرو‘‘۔

’’سر حقِ شاگردی کی کیا بات' آپ واقعی بہت بڑے فنکار ہیں‘‘۔

’’ہش' خاموش' کوئی سن لے گا تو بھیڑ لگ جائے گی‘‘۔

’’شاہد تم نے میرے پینٹنگ دیکھی‘‘؟

’’دیکھی! کچھ خاص نہیں لگی‘‘۔

’’ارے کیا کہہ رہے ہو‘‘۔

’’آپ تعریف چاہتے ہیں تو کر دی جائے گی‘‘۔

’’ہر فنکار فن پارے کی تخلیق کے بعد داد چاہتا ہے۔ جھوٹی ہی سہی۔ بیچارہ فنکار۔

’’مگر سر آپ کی پینٹنگس واقعی قابل تعریف ہوتی ہیں‘‘۔

’’لگے جھوٹی تعریفیں کرنے‘‘۔

’’تمہارا افسانہ دیکھا‘‘۔

’’کیسا لگا سر‘‘؟

’’ٹھیک ہے مگر تم نے ہندو کی بچی کے لئے ’’منی‘‘ کیوں استعمال کیا؟ یہ منیاں چنیاں تمہارے ماحول میں رہا کرتی ہیں‘‘۔

’’سر آپ نے وائلن تو کبھی سنایا نہیں‘‘

’’سنا دوں گا‘‘۔

’’سر آپ نے اپنے اندر اتنے سارے فنکاروں کو چھپا رکھا ہے‘‘۔

’’پھر‘‘۔

’’گستاخی معاف! آپ کسی کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں‘‘۔

’’یہی تو میرا المیہ ہے‘‘۔

’’وجہ سر‘‘!

دیکھو! کبھی گردش روزگار مہلت دے تو ایک ساتھ کئی دھماکے کروں گا‘‘۔

’’فرصت نکالئے سر‘‘۔

’’اتنی جلدی کیا ہے۔ اگر مجھے فرصت نہیں ملی تو تم چیخ چیخ کر اعلان کرتے پھرو گے کہ سر ایسے تھے سر ویسے تھے‘‘۔

’’شاہد مبارک ہو‘‘۔

’’شکریہ سر' یہ آپ اساتذہ کی جوتیوں کا صدقہ ہے‘‘۔

’’جاؤ دار جلنگ اچھی جگہ ہے۔ طبیعت لگے گی اور سنو شاگردوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنا‘‘۔

’’اچھا سر‘‘۔

’’اور دیکھو لکھنے پڑھنے کے کام میں سستی نہ کرنا۔ میری خواہش ہے کہ تم تصنیفات کی دنیا میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہنگامہ کردو"۔

"سرِوہ" ترجمہ اور اس کا فن" کا کیا بنا۔ کب تک چھپ رہی ہے"۔

"شاہد! تم میری پریشانیوں سے واقف ہو۔ ذرا قرار آئے تو چھپنے چھپانے کا کام شروع کروں"۔

اور وہ قرار وحید عرشی کو جنوری ۱۹۸۶ء کی اس تاریک صبح تک نہیں مل سکا جس تاریک صبح کو انہوں نے بھابی جان خرم جہاں، اپنے بچوں، بڑی بھابی، اپنے بھانجے خواجہ احمد حسین (ببّو) اور مجھ جیسے اپنے بے شمار چاہنے والوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت لی۔

نکلتا ہوا قد، بھرا بھرا جسم، خوب صورت خوابیدہ آنکھیں، مترنم آواز، پان کی پیک سے سرخ رہنے والے ہونٹ، پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے انداز کی چال اور ہر دم مسکراتا چہرہ۔ وحید عرشی کا سراپا تھا۔ اخلاق، محبت اور مروت کی خیرات تقسیم کرتا ہوا ان کا وجود اندر سے کتنا چور چور تھا اس کا اندازہ ان لوگوں کو بھی نہیں ہو سکا جو ان کے ساتھ بیٹھ کر کیرم کھیلا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو بھی نہیں جو نیا بازار کانکی نارہ میں سائیکل کی دکان کے سامنے ٹوٹے ہوئے بنچ پر بیٹھے ان سے خوش گپیاں کیا کرتے تھے۔ ان کے درد کو بھی نہیں سمجھ پا رہے تھے جو ان کے اشعار پر سر دُھنا کرتے تھے اور وہ بھی نہیں جو ان کی انگلیوں کو کاغذ پر دل رکھتے یا لکڑی یا پتھر کی سلوں کو شکلیں دیتا دیکھا کرتے تھے۔ بقول وکیل اختر مرحوم۔

اس شخص کے غم کا کوئی انداز لگائے
جس شخص کو روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے

وحید عرشی اندر اندر پگھلتے رہے مگر چراغ کی طرح اخلاقی قدروں کے انحطاط کی اتھاہ تاریکی کا سینہ چاک کرتے رہے۔ پریشانیاں جھیلتے رہے مگر اپنی محفلوں کو اپنے تبسم سے منور کرتے رہے۔ فکرِ معاش کی صلیب پر لٹکے رہے اور مسیحِ وقت بن کر دردِ غم جھیلنے والوں کا درد بانٹتے رہے، غموں کے شریک رہے۔

اپنے الفاظ میں۔

غمِ حیات کی کیلیں تھیں دست و پا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے

لوگوں نے جس کو محض شاعری خیال کیا وہ ان کی حیات کا المیہ تھا جو ان کی شکل میں رقم ہو رہا تھا۔

وحید عرشی کا مقام نہ حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول تھا نہ بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی کالج۔ وہ ہمارے عہد کے جینیس تھے جن کو تہہ در تہہ صلاحیتوں کی بنیاد پر چار دانگ عالم میں مشہور ہونا تھا۔ وہ گرودیو کے بنگال میں گرودیو کی طرح بیک وقت شاعر تھے اور نثار بھی۔ وہ موسیقار تھے اور مصور بھی۔

وہ سنگ تراش بھی تھے اور مغنی بھی تھے۔ کاش کہ گردشِ روزگار انہیں وہ مہلت دی ہوتی جس مہلت کی تمنا میں وہ اُداس ہو جایا کرتے تھے۔

وہ مہلت انہیں مل گئی ہوتی تو ہمارا ادب بھی اس بات پر فخر کر سکتا کہ ہم ٹیگور کی طرح ہمہ صفت فنکار رکھتے ہیں مگر۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

وحید عرشی کو غالباً اپنے جلد رخصت ہو جانے کا یقین ہو چلا تھا تبھی انہوں نے وہ طویل حزنیہ نظم لکھی تھی جس کا عنوان "پھول" تھا۔

توڑلے توڑلے اب دیر نہ کر
دھول اپنی بھی نہ قسمت ہو کہیں

وحید عرشی کی شخصیت کا ہر پہلو متقاضی ہے کہ اس پر بھرپور روشنی ڈالی جائے مگر یہاں تو محض خراجِ عقیدت کی پیشی کی غرض سے کچھ باتیں ضبط تحریر میں آ گئیں۔ انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے وقت سر تعظیم کو جھکنے لگتا ہے، آنکھیں بہنا شروع ہو جاتی ہیں، دل بے قابو ہونے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت کی بہاریں عطا کرے اور ان پھولوں کو اپنی حفاظت میں رکھے جن کا مالی انہیں وقت کی تیز دھوپ میں کوئی سائبان دیے بغیر رخصت ہو گیا۔

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زنجیر کھینچ کر وہ مسافر اُتر گیا

..........منوّر رانا

ریل کی کھڑکیاں کتنی ہی خوب صورت کیوں نہ ہوں گھر کے دریچے کا بدل نہیں ہو سکتیں' اسٹیشن کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو گھر کا آنگن نہیں بن سکتا' پٹریاں کتنی ہی چمک دار ہوں چراغ نہیں بن سکتیں' ڈبے کتنے ہی آرام دہ ہوں کمرہ نہیں بن سکتے لیکن وحیدؔ عرشی نے برسوں انہی کھڑکیوں سے جھانکا' ڈبوں میں سفر کیا' پٹریوں کی چمک سے روشنی حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے ساری زندگی ریل کی پٹریاں پار کرنے کا عمل جاری رکھا۔ صبح سویرے جب نیند ماؤں کی طرح تھپکیاں دے کر سلانا چاہتی ہے' وحیدؔ عرشی جوٹ مل کے مزدوروں کی طرح اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ریل کا انتظار کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ پھر ذرا ہی دیر میں ریل گاڑی وحیدؔ عرشی کو اپنے سینے سے لگا کر کلکتے لے آتی تھی اور ادھر جب بچے جاگتے اور باپ کو نہ دیکھتے تو اُداس ہو جاتے لیکن ماں اُمید کے کھلونے بچوں کے سامنے رکھ دیتی تھی (اب تو سب سے اچھا کھلونا بھی ٹوٹ گیا) ریل سے اُتر کر بس کے سفر کے بعد کافی دور تک پیدل چل کر وحیدؔ عرشی کالج کی کتابوں میں ڈوب جاتے تھے۔ شام کو جب وہ گھر واپس پہنچتے تو ٹرین کی بھیڑ' سفر کی تکان اور ذہنی پریشانیوں کے دکھ کو چائے کی پیالی میں گھول کر پی جاتے تھے' مسکراتے ہوئے اپنے بچوں کی طرف دیکھتے اور پھر گھر کے برابر والی پان کی دُکان کی طرف روانہ ہو جاتے تھے جہاں وفا سکندر پوری ان کے منتظر دکھائی دیتے۔ وقت گزاری کے لئے یہ لوگ گھنٹوں اپنے اپنے دکھوں کی کتاب ایک دوسرے کو پڑھنے کے لئے دیتے تھے حالانکہ وحیدؔ عرشی کی کتابِ زندگی بہت کم صفحوں کی تھی لیکن اس کتاب کو پڑھنے کے لئے سبھی بے قرار رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی کتاب پر لفظ ''مسکراہٹ'' آنسوؤں سے تحریر کیا تھا' انگاروں پر شبنم کی بوندوں کو سجایا تھا' وہ قلم کو تلوار نہیں بناتے تھے' بانسری بنا لیتے تھے۔ وہ مجیب الحق کے بچوں کو بھتیجہ نہیں بیٹا سمجھتے تھے۔

وہ پرتاپ گڑھ کے باسی تھے لیکن انہوں نے جلیلؔ مانک پوری کی طرح دریاؤں کے چکر نہیں لگائے۔ بھیک تو بری چیز ہے! اس شخص نے تو کبھی اپنا حق بھی نہیں مانگا۔ اگر اس نے حق مانگ لیا ہوتا تو ایک ٹوٹے سے گھر کے میلے بستر پر اس کی موت کبھی نہیں ہوتی' آکسیجن سلنڈر کے لئے اس کے گھر

والے مارے مارے نہیں پھرتے' پروفیسر عبدالرؤف کو کسی سے بچوں کا خیال رکھنے کو نہ کہنا پڑا' اس کی بھتیجیوں کو کان میں برسوں پرانی نیم کے تنکے نہ ڈالنے پڑتے بلکہ سونے کی بالیاں جھولتیں' اس کے گھر میں اینٹوں کا بے ترتیب فرش نہ ہوتا' قالین ہوتے' گھر کی دالانوں میں پھٹی ہوئی چادریں نہ پڑی ہوتیں' ریشمی پردے کسمسا رہے ہوتے لیکن وہ تو ایک پیڑ تھا' سایہ دار پیڑ' ایک میٹھے پانی کا چشمہ تھا' وہ ایک خوب صورت جھیل تھا جس میں پرندے نہاتے تھے' نمازی وضو کرتے تھے اور بچے اپنی لکھی ہوئی تختی دھوتے تھے۔ بھلا جھیل کب کسی سے اپنا حق مانگتی ہے۔ وہ بہت کرتی ہے تو لوگوں کو ان کا عکس اپنے آئینے میں دکھائی دیتی ہے۔

لوگ تو پیاس بجھاتے ہیں چلے جاتے ہیں
اور دریا ہیں کہ چپ چاپ رواں رہتے ہیں

وحیدؔ عرشی کی مسکراہٹ میں پیڑ کی چھاؤں کا سکون' چاندنی کا رسیلہ پن' غزل کی شگفتگی اور خوش الحال پرندوں کا بھولا پن شامل تھا لیکن ان کا جسم مختلف قسم کی بیماریوں کا شوردم تھا۔ ان کے کھوکھلے جسم میں کئی بیماریاں سانپوں کی طرح پنپ رہی تھیں۔ ان بیماریوں میں ایک خطرناک بیماری خودداری اور انا کی تھی جو ان کے جسم کے قیمتی خون کا قطرہ قطرہ چاٹ رہی تھی۔ ایک روتے ہوئے آدمی کا کھلکھلا کر ہنسنا کتنا دشوار کام ہے۔ یہ ان کی موت کے بعد اندازہ ہوا۔

۲۵ جنوری سے ہی اس خوددار شاعر نے مستقل طور پر چارپائی پکڑ لی۔ زندگی اس سے منہ موڑ لینا چاہتی تھی۔ سانسوں کی ریت جسم کی مٹھی سے نکل جانا چاہتی تھی اور یوں بھی اگر باندھ کمزور ہو جائیں تو نالے بھی دریا بن جاتے ہیں۔ زندگی کی اس دانستہ بے وفائی سے وہ دل برداشتہ تھے لیکن ناراض قطعی نہیں تھے۔ وہ ناراض ہونا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ کیوں کہ ابھی تو انہیں ماں جیسی بھابی کی خدمت کرنا تھی' پھول جیسے بھتیجے بھتیجیوں کی پرورش کرنا تھی' کسی کی مانگ کے سیندور کا قرض ادا کرنا تھا' روئی کے گالوں جیسے بچوں کی حفاظت کرنا تھی۔

اپنے لئے ہار کوئی نہ جیت ہے
ہم سب ہیں دوسروں کی لڑائی لڑے ہوئے

بیماریاں تو غریب گھروں کو برباد کرنے کی قسم کھا کر نکلتی ہیں۔ مختصر سی مزدوری وہ بھی روزانہ کی تھکا دینے والی مسافت طے کرنے کے بعد........بھوانی پور کالج (کلکتہ) کا فاصلہ ۴۰ کلومیٹر........وحیدؔ عرشی کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی' یعنی ایک کلومیٹر سالانہ کے حساب سے اس شخص نے زندگی خرچ کی تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ریل کی کھڑکیوں کی فولادی سلاخوں پر سر رکھے رکھے سوجانے والے اس شاعر نے کبھی خواب نہیں دیکھے تھے‘ وہ تو ساری زندگی جاگتا رہا اور کیوں نہ جاگتا‘ گھر میں دوپٹہ سنبھال کر اوڑھی ہوئی بھتیجیاں‘ سفید چادر سے بکھرے ہوئے بال اور سونی کلائیاں ڈھانپتی ہوئی بھابی‘ کمرے میں بڑے بھائی کی تصویر‘ آنگن میں ہواؤں سے کھیلتا ہوا پروفیسر مجیب کا چھوڑا ہوا چراغ! وہ تو ان بچوں کے بھی باپ جیسے تھے‘ ان کے آنگن میں لہلہاتا ہوا نیم کا پیڑ تو موسم موسم پھلتا پھولتا تھا لیکن ان کے معصوم ہونٹوں پر مسکراہٹ ہر فصل میں کھلی رہتی تھی‘ کتنی کڑوی مسکراہٹ رہی ہوگی وحیدؔ عرشی کی۔ شاید اسی لئے وہ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ہر وقت پان کھاتے رہتے تھے۔

جس دن سیانی ہوتی ہوئی بھتیجیوں نے شوق میں نیم کے تنکے اپنے کان میں ڈالے اسی دن سے وہ زیادہ پریشان رہنے لگے پھر بھلا وہ نرسنگ ہوم کیسے جاتے‘ جسے بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہوں وہ اپنے ہاتھ پیلے ہوتے ہوئے چہرے کو کبھی نہیں دیکھتا بلکہ وہ آئینہ ہی نہیں دیکھتا........آئینہ تو حسن دیکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ آئینے میں بیماری نہیں دیکھی جاتی۔

ہزاروں قد آدم آئینے ہیں
مگر ترسا ہوں چہرہ دیکھنے کو

”مجھے بے موت مرنے سے بچالو‘ لیکن مزدوروں کی بستی میں اسپتال کہاں‘ اسپتال ہے تو دوائیں کہاں‘ دوائیں ہیں تو ڈاکٹر کہاں‘ ایمبولنس ہے تو ڈرائیور کہاں‘ ایک خوددار شاعر کی سانسیں آکسیجن کی محتاج ہوگئیں لیکن اس شخص نے محتاج بن کر جینا سیکھا ہی نہیں تھا وہ تو پلاسٹک کے بے مصرف ٹکڑوں سے بٹن بنالیتا تھا‘ پاؤں میں چبھنے والے کانٹے سے خلال کا کام لیتا تھا‘ لکڑی کے فضول ٹکڑوں سے غالبؔ کی تصویر بنا ڈالتا تھا‘ روندی ہوئی ملائم مٹی سے میرؔ و اقبالؔ کے مجسمے ڈھال لیتا تھا‘ تلخیوں اور حادثوں کو تراش کر غزل بناتا تھا‘ شیشوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے دل بناتا تھا۔

محلے والے میرے کار بے مصرف پہ ہنستے ہیں
میں بچوں کے لئے گلیوں میں غبارے بناتا ہوں

اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے سے کچھ دنوں پہلے ایک شام وہ البم سے اپنی تصویریں نوچ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ البم سے تصویروں کو الگ کرنے میں گوشت سے ناخن جدا کرنے والی تکلیف ہو رہی ہوگی لیکن وہ تو دکھ درد کی بندشوں سے بہت پہلے ہی رہا ہو چکے تھے۔ معصوم شرقی کا خیال تھا کہ شاید وہ اپنی نشانیاں ہٹا رہے تھے لیکن نشانیاں کہاں مٹتی ہیں۔ زخم اگر بھر بھی جائے تو اس کا نشان باقی رہتا ہے۔

وحیدؔ عرشی کی نشانی پانی پر لکھی ہوئی تحریر نہیں ہے۔ ان کی قیمتی تصویریں ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔ پھول سے بچوں کی شکل میں خوب صورت غزلوں کی شکل میں اور نہ بھولنے والی یادوں کی شکل میں۔ وحیدؔ عرشی مرے نہیں بلکہ وہ اس وقت تک نہیں مر سکتے جب تک اس دنیا میں مسکراہٹ موجود ہے‘ ہر مسکراتے ہوئے ہونٹ وحیدؔ عرشی کی یاد دلائیں گے۔

غزل میں سہل نہیں جاں نکال کر رکھنا
یہ زندگی ہے ہماری سنبھال کر رکھنا

ہر برس کانکی نارہ سے مشاعرے والے یا ملنے والے وحیدؔ عرشی کا پیغام لے کر آتے تھے لیکن اس بار کوئی صاحب ان کی موت کی خبر لے کر آئے ہیں۔ وہی صاحب یہ بھی بتا گئے کہ مٹی عصر کی نماز کے بعد ہوگی لہٰذا رئیس آنولوی اور حبیب ہاشمی کے ہمراہ میں بھی کانکی نارہ کے لئے روانہ ہوگیا۔ ممکن ہے یہ لوکل ٹرین وحیدؔ عرشی کو پہچانتی رہی ہو کیوں کہ اس کی رفتار سے بھی تھکاوٹ اور بیزاری کا احساس ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر ہر چہرہ وحیدؔ عرشی کا معلوم ہو رہا تھا۔ ہم لوگوں نے ریلوے لائن پار کی اور ان کے گھر کی طرف چلنے لگے۔

میں کانکی نارہ کئی بار جا چکا ہوں لیکن شب اندھیرے میں۔ دن کی روشنی میں جب وحیدؔ عرشی کا‘ وحیدؔ عرشی کے بچے اور وحیدؔ عرشی کا چہرہ دیکھا تو میں پچھتانے لگا کہ کاش میں ادھر کبھی دن کی روشنی میں بھی آیا ہوتا۔

گھر کے آنگن میں نیم کا پرانا پیڑ‘ مکان کی کمزور دیواروں پر بے ترتیب بیلیں‘ دروازے پر ایک میلا سا پردہ‘ اس پردے سے جھانکتی ہوئی ایک تصویر جس پر ”اللہ“ لکھا ہوا تھا۔ تصویر کے نیچے وحید عرشی اور مرحوم مجیب صاحب کے بلکتے ہوئے یتیم بچے‘ اندر سے ابھرتی ہوئی دو متواتر چیخیں‘ ایک بھابی کی چیخ جس میں ماں کا درد بھی شامل تھا‘ ایک اور نسوانی چیخ جس میں پروفیسر عبدالرؤف کی بوڑھی سسکیاں بھی لرز رہی تھیں لیکن پروفیسر عبدالرؤف کے چہرے پر ایک سکوت تھا‘ جو سمندروں میں ہوا کرتا ہے۔

گھر کے سامنے ایک اسکول اور اسکول سے بالکل ملی ہوئی ایک خوب صورت مسجد جس کے اونچے اونچے مینار چودہ سو برس کی کہانیاں سناتے ہوئے صدر دروازے کے پاس رکھا ہوا ایک جنازہ۔ امام مسجد نمازِ جنازہ پڑھاتے ہوئے لیکن آج تو امام صاحب وحیدؔ عرشی کے پیچھے کھڑے ہیں۔

گھر کے دروازے سے جھانکتے ہوئے وحید عرشی کے ننھے ننھے بچے‘ جیسے معصوم فرشتوں کی ٹولی‘ جیسے تھالی میں رکھے ہوئے پھول‘ جیسے پر جوڑ کر بیٹھے ہوئے کبوتر‘ جیسے رحل میں رکھی ہوئی مقدس کتابیں‘

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جیسے طاق پر رکھے ہوئے نازک کھلونے‘ جیسے مصور کی نامکمل تصویریں‘ جیسے ادھ کھلی بیلے کی کلیاں‘ جیسے ہنسی کے لئے کھلتے ہوئے ہونٹ‘ جیسے آدھی لکھی ہوئی کہانی‘ جیسے نامکمل غزل۔

ہوا کا رُخ بدلنا سارے وعدوں کا بکھر جانا
کسی کا در سے تکنا اور کسی کا دار پہ جانا

بلکتے ہوئے چہروں اور چیختی ہوئی آنکھوں کو عمر کا زخم بخش کر وحیدؔ عرشی کا جنازہ اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہونے لگا لیکن یہ کیا! وحیدؔ عرشی تو ہمیشہ اپنا سفر سویرے شروع کرتے تھے۔ آج سرشام ہی گھر والوں کو اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے خدا حافظ کہتے ہوئے چل پڑے۔ آج انہوں نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں‘ ہزار ہا سوگواروں کا ایک طویل قافلہ جس میں ادیب وشاعر بھی‘ ڈاکٹر و مریض بھی‘ پروفیسر و طلبہ بھی......ایک مریض پیس میکر کے سہارے اپنی دھڑکنوں کو گنتا ہوا جسے کچھ دنوں پہلے وحیدؔ عرشی نے تسلیاں دی تھیں‘ حوصلہ دیا تھا اور مسکراتے ہوئے زندہ رہنے کا درس دیا تھا۔

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے

ریل کی پٹریوں سے وحیدؔ عرشی کا بہت پرانا رشتہ تھا لیکن ریل کی پٹریاں ہمیشہ انہوں نے اکیلے پار کی تھیں۔ آج ریل کی پٹریاں پار کرتے ہوئے ایک پُل بھی پڑا لیکن وہ چار آدمیوں کے کاندھے پر سوار تھے۔ قبرستان میں ماتمی خاموشی‘ ناریل کے پیڑ اور ایک گھنیرے درخت کے بیچ‘ قبر میں لیٹے ہوئے وحیدؔ عرشی کے والد محترم! باپ کی قبر کے پاس ہی آرام کرتے ہوئے پروفیسر مجیب‘ فرمانبرداری بھائی بھی خاموشی سے بڑے بھائی کے برابر میں لیٹ کر سو گیا۔

غزل کھا گئی نوجواں کیسے کیسے

قبرستان سے واپسی میں وحیدؔ عرشی کے بچپن کے دوست منور حسین ملے۔ میں نے ان سے ازراہِ معلومات پوچھا کہ اس قبرستان میں قبریں بہت کم ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے کہ رانا صاحب‘ یہاں کے لوگ مرنا نہیں چاہتے لیکن دواؤں اور طبی سہولتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ وحید عرشی تو عام آدمی نہیں تھے۔ وہ تو اُردو کے خاموش مجاہد تھے‘ اُردو کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ یہ اُردو کی محبت ہی تو تھی کہ وہ حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول کی پندرہ سو روپیہ کی نوکری کرنے کے بجائے بھوانی پور کالج (کلکتہ) میں ۶۰۰ روپیہ کی غلامی کر رہے تھے۔ دراصل وہ اس غیر مسلم علاقے میں جلتی ہوئی شمع اُردو کو بجھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے‘ وہ ۴۰ کلومیٹر کا سفر طے کر کے

پڑھانے یا پیسہ کمانے نہیں آتے تھے۔ یہ مسافت تو وہ اُردو کو بچانے کے لئے طے کرتے تھے۔ وہ اُردو کے سچے خادم تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی نمائشی دوشالہ نہیں اوڑھا‘ کوئی ادبی دُکان نہیں سجائی‘ کسی اکاڈمی کے آگے دست طلب نہیں پھیلائے‘ ان کی تخلیقوں نے کتابت یا طباعت کی بھیک نہیں مانگی۔ انہوں نے کبھی کوئی خوشامدی ڈگڈگی نہیں بجائی۔ وہ تو بانسری کی ایک میٹھی دھن تھے۔ اس دلچسپ کتاب کا ایک حصہ تھے جس کو اندر اندر دیمک لگ رہی تھی جس کی دفتی سے جلد اکھڑنے لگی تھی۔

گھٹی گھٹی ہوئی چیخیں گلوں میں چھوڑ گیا
وہ عمر بھر کی رفاقت پلوں میں چھوڑ گیا

وکیل اختر اور مظفر حیدری کے بعد وحیدؔ عرشی کی موت تیسری دردناک موت ہے۔ ہزار پانچ سو روپیوں کی انعامی بھیک دے کر ٹرخانے والی اکاڈمیاں ان شہیدوں کے بچوں کے مستقبل کو برباد ہونے سے بچالیں۔ ان چراغوں کی حفاظت بہت ضروری ہے ورنہ ادب کی آنکھیں بے نور ہو جائیں گی۔ باہر کے لوگوں کو انعام کی رشوت دے کر خوش کرنے کے بجائے وہی رقم لواحقین کو ملتی رہے تو ان لوگوں کی روحیں قبروں میں بے چین نہیں رہیں گی۔ فیضؔ اور فراقؔ کے مجموعے تو برابر ہی چھپتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وکیل اختر کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسوؤں کو کتابی شکل میں لایا جائے۔ مظفر حیدری کے بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کی بے بسی کو کاغذ پر تحریر کیا جائے۔ علاج کی سہولت کے بغیر مرجانے والے وحیدؔ عرشی کو امدادی اور تحریری خراجِ پیش کیا جائے۔

اے خدا پھول سے بچوں کی حفاظت کرنا
مفلسی چاہ رہی ہے مرے گھر میں رہنا

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وحید عرشی کی شاعری ـــــ ایک سرسری جائزہ

حیدر صفت

مغربی بنگال کے اردو شاعروں میں جو لوگ ۱۹۷۰ء کے آس پاس اپنی شناخت بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے ان میں اقبال کرشن، کامل اختر اور وحید عرشی ایسے نام تھے جنہیں اس وقت نئی نسل کا نمائندہ شعراء کہا جاتا تھا۔ اقبال کرشن ان میں سے سب زیادہ معتبر نام تھا۔ کامل اختر ایک سب سے زیادہ مشہور اور وحید عرشی ایک کم گو مگر قابل توجہ شاعر۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک تنظیمی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کر تخلیقی سطح پر اپنی آخری ہچکی لے رہی تھی۔ پھر بھی اس کے اثرات باقی تھے۔ یہ قصہ صرف مغربی بنگال کا نہیں تھا۔ پورے برصغیر ہند و پاک میں ترقی پسند تحریک کے ہمنواؤں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ خود اس تحریک کے علمبرداروں کے اسلوب میں ایک نمایاں تبدیلی آنے لگی تھی کہ شراب نئی بوتلوں میں بھری جا سکے۔ بعد میں اسی کو ترقی پسند ناقد محمد حسن نے ترقی پسندی کی توسیع یا ادب کی تیسری آواز کہا۔ دوسری طرف نئی نسل اسلوب کے ساتھ ساتھ مصنوعات میں بھی تبدیلی کی خواہاں تھی اور بقول وزیر آغا اب اردو شاعری کا سفر باہر سے اندر کی طرف تھا۔ نئے موضوعات اور نئی لفظیات سے نامانوس قاری بھی اس نئی شاعری میں اجنبیت کے باوجود ندرت کا احساس پا رہا تھا۔

مگر اس نئی نسل میں بھی کچھ لوگ ترقی پسند خیالات کو نئی ڈکشن کے ساتھ اپنا رہے تھے۔ بہت ہی خلوص اور سچائی کے ساتھ وحید عرشی کا شمار ہم ایسے ہی نوجوان شاعروں میں کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کوئی لیبل چپکائے اور بغیر شرمائے ہوئے اپنے محسوسات کے اظہار ہی کو شاعری سمجھا تھا۔ حالانکہ اس وقت خود کو ''جدید'' کہلوانے کا شوق سکہ رائج الوقت کی طرح رواں تھا مگر انہوں نے اپنی شاعری کو اس سکہ کے پاس رہن نہیں رکھا۔

دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی اپنی ابتداء میں رومانیت کے اثرات سے مملو نظر آتی ہے لیکن ان کی رومان پسندی کے پیش نظر عدم مساوات یا نابرابری اور معاشی فلسفہ نہیں جو ترقی پسند شاعروں کے غم یار کی بنیادی وجہ ہوا کرتی ہے اور اسی لئے ہر ترقی پسند شاعر محبت کو اسی

تناظر میں دیکھتا ہے۔ وحید عرشی کی شروع کی غزلوں میں رومانیت کی جو فضا ملتی ہے اس میں معاشی فلسفہ پر دھیان کم ہی دیا گیا ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار:

دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے میری پلکوں میں
کتنے تاج محل ڈوبیں گے پانی کی ان بوندوں میں
بحرِ غم دوراں میں اک اک چیز تمہاری پھینک دی میں نے
یاد مگر بن بیٹھی ساحل ڈوب سکی نہ موجوں میں
تم کو پایا، تم کو کھویا بات انوکھی اس میں کیا ہے
پر وہ خوشبو چھپ جاتی ہے بس جو گئی ہے بانہوں میں

ناکامی کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں تاج محل پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ یادیں ساحل بن کے بیٹھ جاتی ہیں موجوں میں ڈوب نہیں پاتیں۔ خوشبو بانہوں میں چھپ جاتی ہے ـــ ان احساسات کی سچائی سے انکار ممکن نہیں۔ یہ غزل کوئی بیس بائیس سال پہلے کی ہے۔ ظاہر ہے اس وقت وحید عرشی کی عمر بھی اتنی ہی ہوگی۔ اس عمر میں ایسے جذبات کا اظہار، درحقیقت حقیقت کا اظہار ہے۔ ان کی ایک اور غزل جو تقریباً اسی زمانے کی ہے۔

کیسے سناؤں غم کی کہانی سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے کہہ جاؤ، حال کو ہے انکار بہت
بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت
ٹوٹا ماضی کا آئینہ، بکھری یادوں کی کرچیں
زخمی ہیں احساس کے تلوے چلنے سے بیزار بہت

ان اشعار میں نوجوانی کے انہی جذبات کا اظہار ہے مگر ان میں ایک شدت ہے۔ شاعر کا شعور زندگی سے اور قریب تر ہو گیا ہے۔ اسی لئے ان کے غم میں وسعت ہے اور کائنات کی جھلک بھی۔ اپنی ابتدائی شاعری کے زمانہ میں جب ذرا سا آگے بڑھ کر وہ یہ کہتے ہیں۔

غم حیات کی کیلیں تھیں دست و پا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے

تو ان کا احساس ذاتی نہیں رہ جاتا بلکہ عصر حاضر کا قصہ بن جاتا ہے اور قاری اس شعر کے آس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پاس اپنی زندگی کی پرچھائیاں ڈھونڈنے لگتا ہے۔ چھوٹی بحروں میں انہوں نے جو غزلیں کہی ہیں ان سے غزل کی وہ روایت ملتی ہے جو میرؔ سے عبارت ہے۔ مگر میرؔ کی دریافت انہوں نے ناصر کاظمی یا خلیل الرحمٰن اعظمی کے حوالوں سے نہیں کیا۔ یہاں بھی ان کی ایک الگ پہچان ملتی ہے۔

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے
دور تک جستجو کے سائے گئے

وحید عرشی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ جو ان کے خیالات کو اور واضح طور پر پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک نظم ہے۔ ''مرہم'' اس نظم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم پر ایک لڑکی بیٹھی کھیل رہی ہے۔ کسی کے جوتے سے اس کا پاؤں کچل جاتا ہے وہ بے ساختہ گالی دے دیتی ہے۔ ''حرامی'' اور پھر اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونوں سے کھیلنے لگتی ہے۔ اس نظم میں جو علامتیں ہیں ان سے سماج کے مختلف طبقوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ خاص کر وہ طبقہ جو استحصال ہونے کے بعد صرف گالی دینے پر ہی اکتفا کرتا ہے اور پھر اپنے ٹوٹے کھلونوں سے بہل جاتا ہے۔

وحید عرشی سے ہم اور بھی بہت کچھ امید کر رہے تھے مگر ان کی بے وقت موت نے ان تمام امیدوں پر خاک مل دی۔ وحید عرشی اب اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ بہت کم کہنے اور اس سے بھی کم چھپنے کے باوجود ان کی شاعری مغربی بنگال کی اردو شاعری کی رفتار کا پتہ دیتی ہے۔ وکیل اختر کے بعد وحید عرشی کی موت سے مغربی بنگال میں اردو شاعری ایک زبردست سانحہ سے دوچار ہوئی ہے۔ آخر میں ہم انہی کے ایک شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کرتے ہیں۔

بے اختیار آج بھی آنسو نکل پڑے
کیسے تجھے بھلانے کی کوشش کرے کوئی

(صفحہ:۳۳ ''مغربی بنگال'' یکم مئی ۱۹۸۶ء جلد:۳۳، شمارہ:۹)

وحید عرشی .... بحیثیت نثر نگار

.... زماںؔ قاسمی، کانکی نارہ (شمالی ۲۴ پرگنہ)

''زندگی کی کہانی بھی کتنی عجیب ہوتی ہے آنکھیں بند ہوتے ہی آدمی افسانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کا یہ مختصر سا سفر اتنا طویل کیوں محسوس ہوتا ہے اتنا دشوار کیوں ہوتا ہے؟ اس نے بھی شاید یہی سوچا ہوگا اور ایک برگد کو گواہ بنا کر بغیر کھائے پیئے دو دنوں تک سوچتا رہا اور اتنا ہی بتا سکا کہ حیات کس طرح آسان ہو سکتی ہے''۔

اپنی موت سے گیارہ سال قبل وحید عرشی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کی زندگی کے سفر کا سلسلہ مختصر ہی نہیں بلکہ منقطع ہو جائے گا اور وہ بھی ایک حقیقت سے افسانہ بن کر رہ جائیں گے۔ سدھارت نے عرفانِ حیات کی مشق کے لئے ۱۴ سال تک ایک برگد کو اپنا گواہ بنائے رکھا۔ سدھارت نے تو علم حاصل بھی کیا لیکن وحید صاحب نے ہم سب کو اپنے حالات سے لاعلم رکھا اور عرفان فنا کا سبق صرف ۱۴ دنوں کی مختصر ترین مدت میں حاصل کر لیا۔ سدھارت نے تو ایک برگد کو اپنا گواہ بنایا۔ وحید عرشی اگر کسی کو اپنے دکھوں کا گواہ بنا لیتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی زندگی آسان ہو جاتی۔

وحید عرشی کو دنیا ایک شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ''یادوں کا زنداں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس کے مرتب کمال جعفری ہیں۔ وحید عرشی کا پورا نام خواجہ وحید الحق تھا لیکن ادبی حلقوں میں وحید عرشی کے نام سے مشہور ہوئے۔ پیدائش نارائن پور (کانکی نارہ چوبیس پرگنہ) کی تھی۔ سن پیدائش دسمبر ۱۹۴۳ء تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابھی درجہ دہم میں پڑھ رہے تھے کہ ۱۹۵۸ء میں قومی لائبریری کانکی نارہ، جو اس وقت ضلع ۲۴ پرگنہ کی سب سے بڑی لائبریری مانی جاتی تھی، نے اردو ہائی اسکولوں کے طلبہ کے درمیان ایک مباحثہ کا اعلان کیا۔ لائبریری کے صحن میں بحث و مباحثہ کا پروگرام رکھا گیا۔ کئی اسکول کے طلبہ اس پروگرام میں شامل ہوئے۔ ڈیبیٹ کمیٹی کے ججوں میں مسعود انصاری، محسنی صاحب اور ایوب انصاری شامل تھے۔ موضوع بحث کا عنوان وہیں چنا گیا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ جب نتیجہ کا اعلان آیا تو خواجہ وحید الحق (جو اس وقت تک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وحیدؔ عرشی نہیں بنے تھے) اول انعام کا حق دار بنے۔ دوسرے اور تیسرے نمبر پر بالترتیب محمد اسرائیل اور محمد اسحاق خان آئے۔ یہ دونوں اس وقت چشمہ رحمت ہائی اسکول میں کلاس VIII کے طالب علم تھے۔ اس مقابلے کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ وحیدؔ عرشی اس وقت دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ موضوع بحث فی البدیہہ تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اولیت کا اعزاز حاصل کیا۔ یہی ان کی ذہانت کی دلیل ہے اور یہیں سے ان کا رجحان ادب کی طرف مائل ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں آئی اے اور اس کے بعد بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) کے امتحان میں فرسٹ کلاس پوزیشن حاصل کر کے گولڈ میڈل کے حقدار بنے۔

۱۹۶۶ء میں کانکی نارہ حمایت الغرباء ہائی اسکول سے منسلک ہوئے اور تقریباً بارہ سال تک تشنگانِ علم کو سیراب کرتے رہے۔ ۱۹۷۵ء میں بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی سے وابستہ ہو گئے۔ وحید صاحب کلکتہ اور مضافات کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اپنا تاریخی مجلّہ ''آکاش پتر'' کے ذریعہ انہوں نے کانکی نارہ اور بھاٹ پاڑہ کی پرانی تاریخ اور اس زمانے کی ادبی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں سے روشناس کرایا۔ جو یقیناً ایک کارنامہ ہے۔ وحید صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ صرف ایک شاعر یا نثر نگار ہی نہیں تھے بلکہ بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ بیکار پتھر یا لکڑی کے ٹکڑوں پر غالبؔ اور رابندر ناتھ ٹیگور کی شبیہ اُتار دیتے تھے۔ موسیقی سے بھی انہیں خاصا شغف تھا۔ ایک طرف وہ کامرس کے طلبہ کی خاطر کمرشیل الفاظ کی ڈائریکٹری تیار کر رہے تھے تو دوسری جانب ''ترجمہ اور اس کا فن'' نامی کتاب کی تصنیف کر رہے تھے۔ کچھ مالی پریشانیوں کے سبب یہ کتابیں منظر عام پر نہ آسکیں۔ فکرِ معاش کی صلیب پر لٹکا ہوا شاعر یا ادیب اشاعت کی پریشانیوں کو کیسے جھیل سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو وہ ہمارے عہد کے ایک جینیئس (Genius) تھے۔ ان کا مقام حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول تھانہ بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی کالج بلکہ اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر ادب کی نئی بلندیوں کو چھونا تھا۔ افسوس گردشِ روزگار نے انہیں مہلت نہیں دی۔ وحید عرشی کی شخصیت کا ہر پہلو متقاضی ہے کہ اس پر بھرپور روشنی ڈالی جائے۔ اس مضمون میں یہ بتانا مقصود ہے کہ وحید عرشی نہ صرف ایک مترنم شاعر تھے بلکہ ایک اچھے ادیب بھی تھے۔ نثر نگاری کی صلاحیت ان کے اندر بدرجہ اُتم موجود تھی۔ عمر نے وفا نہیں کی ورنہ مغربی بنگال کے نثری ادب کا دامن بھی موتیوں سے مالا مال ہو سکتا تھا۔ آج جب ہم وحید عرشی (مرحوم) کی دسویں برسی منا رہے ہیں تو ان کی یاد بے طرح آ رہی ہے۔ انہیں

کے نوشتہ جملے آنکھوں کے سامنے جھلملا رہے ہیں۔

وقت ہر زخم پر پھاہا رکھ دیتا ہے لیکن ہر زخم داغ بھی چھوڑ جاتا ہے جس سے کچھ یادیں ہمیشہ کے لئے الجھ کر رہ جاتی ہیں۔

''آج وحید عرشی کو جدا ہوئے دس برس ہونے آئے۔ وقت نے جو سب سے بڑا مرہم ہے عرشی کے زخموں پر پھاہا رکھ دیا ہے لیکن اس داغ کو کیا جائے؟ اس بے کلی کو کیسے سکون ملے جو وقت کے ہاتھوں زخمی ہے؟ ان سے متعلق یادیں تو ہمیشہ کے لئے الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ ان اُلجھی ہوئی یادوں کی ڈور سلجھاتے ہوئے ایک سرا ہاتھ لگتا ہے''۔

''سچائی ہمیشہ نیچے دبی رہتی ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی تکلیف کر کے ہزاروں من لوہے کے نیچے دبی ہوئی سچائی کو نکالیں تو ہر جگہ کتے ہی کی لاش نکلے گی۔ آدمی کی نہیں''۔

اِس ''لاش'' نامی افسانے میں ایک تلخ حقیقت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ وحید عرشی نے کمال چابک دستی سے فساد کے پس منظر میں تناؤ والی کیفیت کو ابھارا ہے۔ افسانہ میں ایک کتے کی لاش کا تذکرہ ہے جو اوپر نیچے رکھی ہوئی ریل کی پٹریوں کے بیچ مر کر سڑ گیا ہے۔ اس سے بہت بدبو پیدا ہو رہی ہے۔ تعفن کے سبب لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہو جاتی ہے۔ ہندو مسلمان سب جمع ہیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر فریق کا خیال ہے کہ اس کے ہی فرقہ کے آدمی کو مار کر یہاں پھینک دیا گیا ہے۔ زوردار آوازوں میں تبصرہ چل رہا ہے کہ اتنے میں پولس کی گاڑی آتی ہے۔ پٹریوں کو ہٹائے جانے پر کتے کی لاش نکلتی ہے۔ افواہوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دبی ہوئی سچائی نکل کر باہر آجاتی ہے۔ اس پس منظر کو ابھارنے اور افسانے کو کلائمکس تک پہنچانے میں وحید عرشی صاحب نے کمال کر دیا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ افسانہ ''لاش'' کو ان کا شاہکار افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف شعر و شاعری پر ان کی گرفت مضبوط تھی بلکہ افسانہ نگاری میں بھی وہ ملکہ رکھتے تھے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ان کی غزلوں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے اور انہیں بے پئے ہی نشہ ہو گیا اور نشہ بھی ایسا کہ آخر دم تک نہیں اترا۔ خود وحید عرشی صاحب کا یہ خیال تھا کہ مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزل کے ایک شعر پر ملنے والی داد دو بوتل کا نشہ رکھتی ہے ان پر داد و تحسین کے پھول برسائے گئے۔ ایک ایک غزل کی سلور جبلی منائی گئی۔ آدمی شاعر نہیں بنے گا تو کیا بنے گا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس نشہ کی کیفیت سے وہ آخر دم تک پیچھا نہیں چھڑا سکے جس کا ثبوت یہ ہے کہ مرتے مرتے بھی غزل کا آخری مطلع کہتے گئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے
دور تک جستجو کے سائے گئے

وحید عرشی کی نثر نگاری کے چند اور نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

''اور وہ بڑھیا بھی پرسکون ہوگئی تھی جو غم سے نڈھال اپنے اکلوتے مردہ بچے کا جسد خاکی کو لئے اس کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی تھی اور اس نے دوبارہ زندہ کرنے کی یہ شرط رکھی تھی کہ کسی ایسے گھر سے ایک مٹھی خاک لانے' اس کے یہاں کوئی موت سے ہمکنار نہ ہوا ہو اور اسے ایک مشت خاک نہ مل سکی''۔

''ان کا سراپا ہی مجھے اس لوک گیت کی طرح لگا تھا جس میں صدیوں پڑنے والے سوکھے کا ذکر ہو اور آج بھی اس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا بتایا جائے''۔

''جب میں ان کے اشعار کو سنتا تو ایسا لگتا جیسے ان کے دل کے پھپھولے پھوٹ کر اشعار کی شکل میں جم گئے ہوں اور جس میں پامال زندگی کی سسک بھی گھٹ گئی ہو''۔

''واقعی بنگال کی سرزمین پرکشش'' ہے۔ الف لیلہ ہزار داستان کے مصنفوں کے ذہن میں بنگال کا حسین اور جادو چٹکیاں لے رہا تھا۔ تقریباً نویں صدی ہجری میں تلنگانہ میں بیٹھے ہوئے ملا وجہی نے اپنی معرکہ آرا مثنوی ''قطب مشتری'' کے لئے بنگال کی حسین وجمیل دوشیزہ کا انتخاب کیا۔ غالب بنگال سے لوٹنے کے بعد ساری عمر ہائے ہائے کرتے رہے۔ مومن کے دامن دل کو بھی بت بنگالہ نے کھینچا اور ان لوگوں کے لئے یہ سرزمین ایک کسک بن گئی جو اسے دیکھ نہیں سکتے تھے''۔ کیا مذکورہ بالا اقتباسات نثری نمونے کے طور پر پیش نہیں کیے جاسکتے۔ کیا ان کی روشنی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وحید عرشی (مرحوم) کی زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ نثر کے اور بھی اعلیٰ نمونے دستیاب ہوتے اور مغربی بنگال کے نثری ادب کے دامن میں کچھ اور موتیوں کا اضافہ ہوتا۔

وحید عرشی کی بے وقت موت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب کا وہ چراغ گل ہوگیا جس کی روشنی میں کانکی نارہ وجگتدل کی ادبی محفلیں جگمگاتی تھیں۔ وہ بنگال کی نئی نسل کے ممتاز شاعر تھے اور منفرد ادیب بھی۔ ان کے پڑھنے اور لکھنے کا انداز نرالا تھا۔ کاش گردشِ روزگار نے کچھ اور مہلت دی ہوتی تو ہمارے اردو ادب کے دامن میں کچھ اور بیش قیمت موتیوں کا اضافہ ممکن تھا اور اس طرح اردو ادب کا دامن اور مالا مال ہوسکتا تھا۔

یادوں کا زنداں

کمال جعفری

وحید عرشی کی یاد آتے ہی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آتے ہیں۔ وہ خاموشی میں ہزاروں غم چھپائے رہتے تھے وہ جب بولتے تھے تو علم ودانش کے موتی بکھیرتے تھے وہ ایک اچھے شاعر' مصور اور معلم تھے۔

وحید عرشی جب مشاعروں میں ایک مخصوص مترنم آواز میں کلام سناتے تو سامعین کے دلوں پر سحر کردیتے اور لوگ بار بار ان سے غزل سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ ان کی غزلوں میں میرؔ کا درد' داغؔ کی سادگی اور غالبؔ کا جدید انداز بیان ملتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جو جدید شاعری کی نئی نسل سامنے آئی اس میں مغربی بنگال کی فضا کے مطابق وحید عرشی کی شاعری پروان چڑھی اور اپنی شناخت قائم کرلی۔ وہ بہت کم کہتے تھے لیکن بہت موزوں اور معنویت سے بھرپور شعر کہتے تھے۔ ان کا منفرد اندازِ بیان ان کی اچھی شاعری کی غمازی کرتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت

☆☆

ارمان کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤ گے بہہ جاؤ گے اشکوں میں

☆☆

ایک تنہائی تھی وہ بھی نہ ہوئی مجھ کو نصیب
کیوں کہ تری یاد کی پرچھائیں مرے ساتھ چلے

☆☆

ہر ایک شخص ہے محتاط اس قدر عرشیؔ
کہ اپنے آپ سے ملتا ہے اجنبی کی طرح

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆☆

راہِ منزل چھوڑ دیتا ہوں ہمیشہ اس لئے
مل گئی منزل تو جہدِ زندگی مر جائے گی

☆☆

غمِ حیات کی کیلیں تھیں دست وپا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے

☆☆

یہ اشعار ان کی ذہانت، کربِ ذات، حسرت و یاس، جہد زندگی اور خوشی و غم کی ملی جلی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان میں ان کے لہجے کی انفرادیت اور فکر کی بلندی نمایاں ہے جو ایک کامیاب غزل گو کا وصف ہوتا ہے۔

[میں نے ان ہی کے ایک شعر سے ان کے مجموعہ کلام کا نام ''یادوں کا زنداں'' رکھا ہے جسے احباب اور متعلقین نے سراہا ہے۔] ان نظموں میں نوحہ (پنڈت جواہر لعل نہرو)، بچھڑی ہوئی ماں کے نام زندگی، منزل، مہاتما گاندھی، دردِ صبح تمنا، گمنام پھول اور فساد فکری وفنی اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ ان نظموں میں وحید عرشی نے بالکل نئی بات کہنے کی کوشش کی ہے اور موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ غزلوں اور نظموں کی طرح ان کے قطعات بھی پر معنی اور دل کش ہوتے ہیں۔ ''یادوں کا زنداں'' کے خالق وحید عرشی کی تعلیم وتربیت میں خود ان کے بڑے بھائی پروفیسر خواجہ مجیب الحق مرحوم نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ پروفیسر خواجہ مجیب الحق مرحوم میرے نہایت شفیق استاد تھے۔ وہ مولانا آزاد کالج (کلکتہ) میں استاد تھے۔ پروفیسر مجیب مرحوم نے بھی بڑی قلیل عمر پائی ان کی وفات ۲۰ اگست ۱۹۸۳ء کو ہوئی۔ ان کے غم میں وحید عرشی مرحوم صدمے سے نڈھال رہتے تھے اور بالآخر ۳ فروری ۱۹۸۶ء کو اپنے پیچھے اپنی اہلیہ خرم جہاں، دو معصوم بیٹے خواجہ دانش اریب، خواجہ یاسر ہمیش اور بیٹی شاذیہ وحید کو چھوڑ کر مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

[مرحوم وحید عرشی مجھ سے عمر میں بڑے تھے لیکن بیحد اخلاق ومحبت سے ملتے تھے ان کی پرخلوص شخصیت اور کلکتے کی خوشگوار یادوں نے مجھے ان کا مجموعہ کلام دہلی سے مرتب کرنے پر مجبور کیا۔ اس مجموعہ کی اشاعت میں ان کی بڑی بہن طیبہ ناز نے اپنے نیک مشوروں سے نوازا اور عملی تعاون پیش

کیا۔ موصوفہ کی دلی تمنا تھی کہ مرحوم کا شعری مجموعہ منظر عام پر آئے لہٰذا اس مجموعہ کی اشاعت میں انہوں نے مالی تعاون دے کر میرا حوصلہ بڑھایا۔ مرحوم کے کلام کو یکجا کرنے میں ان کے بھانجے اسرار الحق عرف پپو نے مدد کی اور پروفیسر عبدالرؤف (کلکتہ یونیورسٹی) جو مرحوم کے استاد اور سسر بھی ہیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

میں جناب مظہر امام صاحب (سابق ڈائریکٹر دوردرشن، سری نگر) کا ممنون ہوں کہ انہوں نے فلیپ کے لئے اپنی گراں قدر آراء سے نوازا۔ میں جناب معین اعجاز اور شمس الزماں صاحب کا بھی ممنون ہوں جن کی قیمتی مشوروں نے سہارا دیا۔ میرے شکریے کے مستحق معصوم شرقی بھی ہیں کہ انہوں نے مرحوم کے چند اشعار فراہم کیے۔ میں جناب منور رانا کا بیحد شکریے کے ساتھ وہ مضمون شامل کر رہا ہوں جو مرحوم کی وفات کے بعد روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' (کلکتہ) میں چھپا تھا۔ امید ہے ''یادوں کا زنداں'' دنیائے شعر وادب میں مقبول ہوگا مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے مرحوم دوست کا مجموعہ کلام چھپوانے میں کامیاب ہوا۔

اس موقع پر وحید عرشی مرحوم کے بہنوئی ڈاکٹر ایم آئی حق مرحوم کی یاد آرہی ہے۔ دراصل اس مجموعہ کلام کو مرتب کرنے کا حوصلہ انہوں نے ہی بخشا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نہایت اخلاق مند انسان تھے وہ بہار انجمن ترقی اردو ہند (ضلع نوادہ) کے صدر تھے انہیں اردو زبان وادب سے بیحد لگاؤ تھا۔ اے کاش! یہ مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع ہوتا۔ آخر میں ہارون رشید فردوسی، پپو اور تمام احباب و متعلقین کا شکر گزار ہوں جن کے مفید مشوروں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔]

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وحید عرشی

جاوید ارشد چودھری

وحید عرشی کے مجموعہ کلام ''یادوں کا زنداں'' ——— کمال جعفری نے مرتب کیا ہے وہ اس مجموعہ میں وحید عرشی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''۱۹۶۰ء کے بعد جو جدید شاعری کی نئی نسل سامنے آئی اس میں مغربی بنگال کی فضا کے مطابق وحید عرشی کی شاعری پروان چڑھی اور اپنی شناخت قائم کرلی۔ وہ بہت کم کہتے تھے لیکن موزوں اور معنویت سے بھرپور شعر کہتے ہیں۔

ان کا منفرد اندازِ بیاں ان کی اچھی شاعری کی غمازی کرتا ہے'' ۱؎

وحید عرشی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں لیکن جو غزلیں انہوں نے کہی ہیں وہ فکر سے بھرپور نظر آتی ہیں۔ انہوں نے غزل میں ترنم اور لہجے کی غنائیت پر زور دیا ہے۔ عہد حاضر کے جبر' عذاب آگہی احساسِ تنہائی وغیرہ کا عکس ان کی غزلوں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

راہِ منزل چھوڑ دیتا ہوں ہمیشہ اس لئے
مل گئی منزل تو جہدِ زندگی مرجائے گی

☆☆

بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت

☆☆

دم بخود جسم تھا خاموشی کھڑی تھی گم سم
ذہن کے شہر سے جب یاد کی بارات چلی

☆☆

۱؎ وحید عرشی اور یادوں کا زنداں: مرتبہ کمال جعفری (ناشر ادارہ ''مخدوم جہاں'' نئی دہلی ۱۹۹۱ء ص ۲۵)

ارمان کے تابوت میں جب بھی وقت کی کیلیں گاڑ چکونگا
پھر جب بھی تم یاد آؤگے بہہ جاؤگے اشکوں میں

مندرجہ بالا اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل کے فن سے واقف ہیں اور میرے خیال میں ان کے یہاں غور وفکر کی بھی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں ذاتی کرب' حسرت ویاس جہد زندگی کے ساتھ کہیں کہیں پر غم جاناں اور غم دوراں کی جھلک بھی نظر آتی ہے ایک جگہ کہتے ہیں۔

آسودگیٔ دل کی تمنا جو کہ وحید
ہر سو غم جہاں کا بلاوا ابھی سے ہے

☆☆

غمِ حیات کی کیلیں تھیں دست وپا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے

مظہر امام نے وحید عرشی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اسی شعر کے پیش نظر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وحید عرشی اس جواں مرگ شاعر کا نام ہے جو تمام عمر صلیب پر لٹکا رہا کیوں کہ غمِ حیات کی کیلیں اس کے دست وپا جڑی ہوئی تھیں وہ یادوں کے زنداں سے نکل بھاگنے کے ارادے کرتا رہا لیکن اس کے گرد ایک اونچی دیوار ایستادہ تھی اور وہاں سے باہر آنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ سوال الگ ہے کہ یہ دیوار معاشرے نے بلند کی تھی یا خود اس نے یا اس کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب اپنے اپنے غموں میں الجھے ہوئے ہیں وہ اپنی داستانِ درد انہیں سناتا رہا کیوں کہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ان سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے جو گراں گوش ہیں'' ۱؎

۱؎ یادوں کا زنداں: (مظہر امام' بیک کور پر رائے)

(دستک' شمارہ-۵' صفحہ: ۱۲۷' مدیر: عنبر شمیم)

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خواب اور حقیقت کے درمیان کا شاعر: وحید عرشی

محمد شمشیر عالم

کسی بھی فنکار کی تخلیقات کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے حالات سے واقفیت حاصل کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی زندگی نشیب و فراز کے کن مراحل سے گزری ہے اور اس کے اثرات اس کی شاعری پر کس حد تک مرتب ہوئے ہیں کیوں کہ اگر شاعری کو داخلی معاملہ بھی مان لیا جائے تو یہ بات اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ داخلی جذبات بھی خارجی عوامل اور محرکات کے ساتھ باہم مل کر ہی برانگیختہ ہوتے ہیں۔ اقبالؔ کی قد آور شخصیت ہمارے سامنے ہے۔ اقبالؔ کی عظمت اور اس کی آفاقیت کو سمجھنے کے لئے اس کے عہد کو سمجھنا از حد ضروری ہے ورنہ افہام و تفہیم کی راہوں میں ہم ٹھوکریں کھاتے نظر آئیں گے اور اقبالؔ کو بھی ادھوری داستانیں کہنے والے ادھورے فنکار سے تشبیہ دیں گے۔ ہر فنکار اپنے عہد اور اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فن پاروں میں ہمیں وہی فضا رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے جس میں خود فنکار کا ذہن پروان چڑھتا ہے اور اس کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ اقبالؔ، غالبؔ اور میرؔ کی عظمت میں کچھ اس کا بھی دخل رہا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کی عکاسی میں بخالت سے کام نہیں لیا بلکہ اس کی ایسی سچی تصویر کشی کی ہم آج بھی عش عش کر اٹھتے ہیں۔

مغربی بنگال کی سوندھی مٹی میں پنپنے والے وحید عرشی کے یہاں اس سلسلے کی بہت ساری کڑیاں مل جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنے اطراف کی مسحور کن مصوری کی ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے عہد کا بیشتر حصہ سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ رنج و غم اور خوشی و مسرت کے بہت اچھے ترجمان ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے سے ''دغا'' نہیں کیا اور یہ بات کسی بھی طرح سے معمولی نہیں کہی جا سکتی۔

وحید عرشی کے یہاں گرچہ بہت کچھ کی تلاش بے سود ہے لیکن ان کے شعری حجم میں جتنے مفید اور قابل غور عناصر موجود ہیں وہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی شاعری درد والم کی شاعری ہے۔ انسانی زندگی کے کرب کی شاعری ہے۔ لیکن یہ شاعری ہمیں "Appeal" اپیل کرتی ہے۔ ہمارے اندر ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ پیدا کرتی ہے یہ ہمیں اُداس تو کرتی ہے لیکن ہم سے جینے کی تڑپ نہیں چھینتی، یاد

آتا ہے کہ مجنوں گورکھپوری نے میر تقی میر کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے کچھ اس قسم کی بات کہی تھی!

''میرؔ کے غم انگیز اشعار پڑھ کر ہمارا دل تو شدت کرب سے ضرور تڑپ اٹھتا ہے لیکن ہم زندگی سے بیزار نہیں ہوتے، ہمیں کسی گھٹن کا احساس نہیں ہوتا''۔

مجھے بھی اعتراف ہے کہ میرؔ رلاتے ضرور ہیں لیکن بے عمل نہیں کرتے۔ ان کے یہاں جوش و سرمستی کا عالم نظر آتا ہے وہ قہقہہ تو نہیں لگا سکتے لیکن ان کے غمگین سے غمگین شعر میں بھی جل ترنگ کی سی ایک موسیقی برابر بجتی رہتی ہے۔

وحید عرشی کی شاعری اچھی ہے لیکن ان سے کہیں زیادہ اچھی ہو سکتی تھی۔ میرے خیال میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو ان کے شعری صلاحیتوں کے بھرپور اظہار میں مانع رہی۔ گرچہ میں ان کی شاعری کو بہت اعلیٰ درجہ کی شاعری نہیں مانتا لیکن شعر و ادب کی اس کساد بازاری کے دور میں جب کہ حقیقی شعراء تک کی پہچان مشکل ہو چکی ہے۔ وحید عرشی اپنی گہری چھاپ ہمارے ذہنوں پر ضرور چھوڑ جاتے ہیں اور جو شخص اس قسم کے اشعار کہہ سکتا ہو اسے معمولی شاعر بھی تو نہیں کہا جا سکتا ہے:

کیا جانیے کیوں تکتے رہے راہ کسی کی
آنے کا تو وعدہ بھی کیا تھا نہ کسی نے

بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت

عرصہ ہوا وزیر آغا کی کتاب ''اقبال کے تصورات عشق و خرد'' کے مطالعے کے دوران کرمک ناداں سے کرمک شب تاب تک ''اقبال کے ذہنی سفر کا ایک مبہم سا خاکہ ذہن کے پردے پر ابھرا تھا پھر میں نے ادھر دھیان نہیں دیا البتہ بہت سی باتیں ذہن و فکر کے نہاں خانے میں ضرور محفوظ رہ گئیں۔ لگتا ہے وحید عرشی نے خاص طور سے اقبالؔ کا مطالعہ کیا ہے یا پھر اسلام کے براہ راست مطالعے نے عشق و خرد کی حقیقت ان پر منکشف کر رکھی ہے۔ گو وہ ''خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کرنے کا ہنر'' نہ جانتے ہوں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ انہیں حیاتِ انسانی کا عرفان حاصل تھا اور یہ بات معمولی نہیں ہے۔ عشق و خرد کے موضوع پر ان کے درج ذیل اشعار میں گرچہ کوئی بڑی بات نہیں کہی گئی ہے لیکن ان کے ذریعہ تخلیق کار کی ذہنی بصیرت اور اس کی فنی درّاکی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے:

وہ نشاں اہل خرد کہتے ہیں جس کو منزل
نقش پا سے ہے جنوں کے وہ ہویدا اے دوست

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کس کو کہیے گا خرد اور کس کو کہیے گا جنوں
اک خودی نا آشنا اک خودی میں مبتلا

غالبؔ نے اردو شاعری میں زندگی کی تہہ بہ تہہ پیچیدگیوں کو جس مشاقی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ویسا اب تک کسی دوسرے شاعر سے نہ ہو سکا حقیقت معنی اور حسن ازل کی تفہیم کا کام انہوں نے بڑے پیمانے پر کیا اور پھر اسے حسین شعری قالب میں ڈھال کر دنیا کے سامنے یوں پیش کیا کہ اردو زبان کی عظمت کا نقش اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ ان کا ایک انوکھا اور اچھوتا شعر جس کی تعریف مقتدر نقادوں نے کی ہے' یوں ہے:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

حسن ازل گرچہ ہر شئے میں موجود ہے لیکن اس نے خود پر ہزار ہا پردے ڈال رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہدین کی نظریں انہیں پردوں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان میں مستور حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ وحید عرشی کا بھی یہی حال ہے۔ انہوں نے تصوف کی وہ منزلیں طے نہیں کی ہیں جن سے گزرتے ہوئے صوفی کا عشق ایک دائرے کی صورت میں آگے بڑھتا ہے اور ''حسن ازل'' کے گرد گھری ہوئی سلاخوں کو معدوم کر کے حقیقت کا ادراک حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

ان کے جلوؤں کی کہاں تاب نظر کو میری
روبرو ہو کے بھی وہ پردہ نشیں ہوتے ہیں

زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے وہ لمحہ لمحہ نئے نئے حادثے سے دوچار ہوتی رہتی ہے اور یہی حادثے اسے لطیف اور پر کیف بناتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر غم کا وجود نہ ہو تو خوشی ونشاط بے معنی ہو کر رہ جائیں۔ فانی بدایونیؔ نے غم حقیقی کو قدرت کا انمول عطیہ سمجھ کر اسے نئی شکل میں پیش کیا۔ غم وافلاس کا ماتم تو سبھی کرتے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ انسان نامساعد حالات میں بھی سینہ سپر رہے اور ذرا بھی نہ گھبرائے بلکہ فطرت کی عطا کردہ بے پایاں صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کا بے جگری سے مقابلہ کرے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ رات کے سیاہ پردے سے ہی آفتاب روشن نمودار ہوتا ہے اور کسی انسان کو اعلیٰ وارفع منصب عطا کرنے سے پہلے قدرت اس کا خواب امتحان لیتی ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ وحید عرشی کی شاعری غم کو پیش تو ضرور کرتی ہے لیکن ہمارے اندر بزدلی اور پست ہمتی کی جذبات نہیں پیدا کرتی بلکہ ان کی شاعری کا اعلان تو یہ ہے کہ:

میکشی ہوگئی پختہ مری شاید کچھ اور
آج پھر ٹوٹ گیا جام خدا خیر کرے

زمانہ بدل رہا ہے انقلابات زمانہ نے دنیا کی ہر شئے کو متاثر کیا ہے۔ انسان بھی بدلنے لگا ہے۔ روحانیت سے مادیت کی جانب ذہن انسانی کے سفر نے ہزاروں نت نئے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ مختلف برائیاں جڑ پکڑتی جا رہی ہیں۔ پرانی تہذیب اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ مٹتی جا رہی ہے اور جو نئی تہذیب اس کی جگہ لینے والی ہے اس میں صالح قدروں کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ مصنوعی خلوص اور جھوٹے پیار کا زمانہ آچکا ہے۔ ہر شخص نے اپنے چہرے پر نقاب لگا رکھی ہے۔ ایسے عہد میں کسی شاعر کے حساس دل کا تڑپ اٹھنا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ وحید عرشی کا دل تو یوں ہی زخم خوردہ ہے۔ وہ جب ان حالات سے دوچار ہوتا ہے تو زخموں میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے۔ غم خوردہ دل کی اس ٹیس کو قاری خود اپنے سینے میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی شاعر کا کمال ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کرے تو جگ بیتی معلوم ہو۔ یہی شاعری کی معراج ہے اور وحید عرشی نے بڑے ہی درد کے ساتھ اس قسم کے اشعار کہے ہیں۔

میں تو خاموش تھا چپ رہ نہ سکے زخم کے لب
میں نے سمجھا ہے سدا تجھ کو مسیحا اے دوست
ارماں کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤگے بہہ جاؤگے اشکوں میں
ایک تنہائی تھی وہ بھی نہ ہوئی مجھ کو نصیب
کیوں تری یاد کی پرچھائیں مرے ساتھ چلی

میں نے وحید عرشی کی زندگی کا بھی مطالعہ کیا ہے اور ان کی شاعری کا بھی۔ ہر اچھا شاعر اپنے معاشرے کا ایک اچھا فرد ہوتے ہوئے بھی دیگر لوگوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی بلند قامت ہوتا ہے۔ ''وہ نئے پتھروں کے اندر ہزاروں اصنام ناتراشیدہ کی کسمساہٹ کو محسوس کر لیتا ہے وہ بلبل کے نغمے صرف سنتا ہی نہیں بلکہ اس کے مفہوم سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ پھولوں کی نزاکت دریاؤں کا حسن درختوں کی شادابی سمندروں کا سکوت اور پہاڑوں کی سربلندی ایسی چیزیں ہیں جن تک پہنچ کر شاعر کا ذہن خموش نہیں رہتا بلکہ بے تابانہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور آخر کار ان کی ''روح'' تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صنم ہزاروں نئے پتھروں کے اندر ہی
تڑپ رہے ہیں ابھی فن آزری کے لئے
تمہارے روئے منور کی ضو میں ڈوب گیا
فلک پر چاند جو نکلا تھا ہمسری کے لئے

مظہرامام نے وحید عرشی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”وحید عرشی اس جوان مرگ شاعر کا نام نہیں ہے جو تمام عمر صلیب پر لٹکا رہا کیوں کہ غم حیات کیلیں اس کے دست و پا میں جڑی ہوئی تھیں“۔

”یادوں کے زنداں“ میں مقید اس شاعر کے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ پھیلی رہی، وہ ہنستے ہوئے زندگی کا ہر دکھ جھیلتا رہا اور پھر ایک شان بے نیازی سے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی حالانکہ اس کی زندگی کی غالباً ہر شام کچھ ایسی ہی اندوہناک ہوا کرتی تھی:

عجیب شام ہے بیمار کی ہنسی کی طرح
کٹے گی آج شب بھی کئی صدی کی طرح

شاعر کو ممتاز کرنے میں اس کے اندازِ بیان کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر غالبؔ فلسفہ اور تصوف کے مسائل کو معمولی انداز میں پیش کرتے اور اقبالؔ کا آفاقی پیغام بالکل عامیانہ ڈھنگ سے سامنے آتا تو کیا انہیں کوئی ممتاز مقام حاصل ہو پاتا؟ ہر اچھا شاعر اپنے انداز سے پہچانا جاتا ہے۔

آل احمد سرور قمطراز ہیں کہ:

”شاعری کی آواز نئی نہیں ہے بلکہ اس میں ماضی کی آوازوں کی گونج ہے“۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دلی دکنی لے کر آج تک اردو شاعری بہت طویل مسافت طے کر چکی ہے۔ ہر طرح کے موضوعات اس کے دائرۂ اختیار میں آچکے ہیں، کیسے کیسے نادر و لطیف خیالات سے اس کا دامن مالا مال ہے اس لئے تکرار لازمی ہے لیکن کسی بھی شاعر کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسی حالت میں رہتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت قائم رکھے اور قاری کے ذہن پر اپنی گہری چھاپ چھوڑ جائے۔ وحید عرشی کا اندازِ بیان بڑا ہی پیارا اور صاف ستھرا ہے کیوں کہ ان کے یہاں تصنع اور بناوٹ کا کوئی گزر نہیں۔ اس لئے ان کی شاعری بہت بھلی معلوم ہوتی ہے اور فوراً دل میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتی ہے:

شاید ابھر آئے نہ کوئی ڈوبنے والا
ساحل پہ کھڑے مدو جزر دیکھتے رہے

مرجھا سکا نہ یاد کی شاخوں کا کوئی پھول
اتنا تو کیا ہے مری آنکھوں کی نمی نے

وحید عرشی ۴۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انہوں نے ٹھیک اس وقت دنیا سے رخت سفر باندھا جب ان کی شاعری خواب و لاشعور کی قید و بند سے نکل کر امید و ایقان کی ایک نئی دنیا آباد کرنے والی تھی۔ یہی وقت تھا جب ان کی شاعری نئے فکری زاویوں اور عصری میلانات کے باہم ارتباط سے ایک نئی شکل میں وجود میں آرہی تھی اور وہ نہایت ہی کامیابی کے ساتھ جانب قدم بڑھا رہے تھے کہ ایک کوندا لپکا اور سارا چمن جل کر راکھ ہو گیا۔ ہوا کے تیز جھونکے نے اس اخلاق شاعر کی شمع حیات کو گل کر کے رکھ دیا۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے

تحریر: زماںؔ قاسمی (کانکی نارہ)

وحیدؔ عرشی کا انتقال صرف ۴۳ سال کی عمر میں ہوا۔ یہ عمر مرنے کی نہیں ہوتی۔ زمانے کی متلاطم موجوں میں ڈوب کر ابھرنے کی ہوتی ہے۔ حالات کی نیرنگیوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے پار اترنے کی ہوتی ہے۔ اس عمر میں تو شعور پختہ ہوتا ہے۔ لاشعور، تحت الشعور کی گرہیں کھلتی ہیں۔ زمانے کے سرد وگرم سے کماحقہ آگاہی ہوتی ہے۔ بصارت بصیرت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ زندگی کے میدان میں وجدانی کیفیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ مگر سچائی یہی ہے کہ ۲۷ ستمبر ۱۹۴۳ کو اس جہانِ رنگ و بو میں آنکھیں کھولنے والا شاعر ۳ فروری ۱۹۸۶ء کو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

یہ اُردو ادب کی بدنصیبی ہے کہ وحیدؔ عرشی جیسا جواں مرگ شاعر تمام عمر صلیب پر لٹکا رہا اور زمانے کو خبر تک نہیں ہوئی۔ غم حیات کی کیلیں اس کے دست و پا میں گڑی رہیں اور اس کا درد اس کے متعلقین، دوست واحباب بھی محسوس نہ کر سکے۔ وحیدؔ عرشی کی بے وقت موت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب کا وہ چراغ گل ہو گیا جس کی روشنی سے مضافات کی ادبی محفلیں جگمگاتی تھیں۔ وہ بنگال کی نئی نسل کے ممتاز شاعر بھی تھے اور منفرد ادیب بھی۔ ان کے پڑھنے لکھنے کا انداز نرالا تھا۔ شعر کہنے کا طرز جدا گانہ تھا۔

عقل اور دل میں تیرے حسن پہ اک بات چلی
کل بہت رات گئے رات ڈھلی
دم بخود جسم تھا، خاموشی کھڑی تھی گم صم
ذہن کے شہر سے جب یاد کی بارات چلی
غم حیات کی کیلیں تھیں دست و پا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے
جاگ پڑے تو گھبرا کر پھر سونا کیا
سپنا ہی تھا ٹوٹ گیا تو رونا کیا

کہاں تلاش کرو گے وہ زندگی عرشی
جو آ کے کھو گئی چوراہے پہ گلی کی طرح

''یادوں کا زنداں'' وحیدؔ عرشی (مرحوم) کے مجموعۂ کلام کا نام ہے جسے کمال جعفری صاحب نے مرتب کیا ہے۔ وہ اس مجموعہ میں وحیدؔ صاحب کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''۱۹۶۰ء کے بعد جدید شاعری کی جو نسل سامنے آئی اس میں مغربی بنگال کی فضا کے مطابق وحیدؔ عرشی کی شاعری پروان چڑھی اور اپنی شناخت قائم کر لی۔ وہ بہت کم کہتے تھے لیکن موزوں و معنویت سے بھرپور کہتے تھے۔ ان کا منفرد اندازِ بیان ان کی اچھی شاعری کی غمازی کرتا ہے''۔

وحید عرشی کے منتخب اشعار کا مختصر جائزہ ہمیں تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ غزل کے فن سے واقف تھے۔ ان کے اشعار میں حسرت و یاس کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف جہد زندگی کے راستے میں پیش آنے والے آلام اور ان سے نبرد آزما ہونے کی کاوشیں بھی ملتی ہیں۔ ایک جانب خوشگوار یادوں کا تصور بھی ابھرتا ہے اور دوسری جانب غمگین لمحات کا عکس بھی جھلملاتا ہے۔

تم کو پایا، تم کو کھویا بات انوکھی اس میں کیا ہے
پر وہ خوشبو چھپ جاتی ہے بس جو گئی ہے باہوں میں
کیسے سناؤں غم کی حقیقت، سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے کہہ جاؤ، حال کو ہے انکار بہت
رہ گزر ایک ہے اندازِ سفر تو دیکھو
کوئے جاناں کوئی پہنچا تو سردار کوئی
پھر تری یاد تصور کے چمن میں سسکی
پھر مری عقل سے کہتا ہے خبردار کوئی
کیا جانئے کیوں تکتے رہے راہ کسی کی
آنے کا تو وعدہ بھی کیا تھا نہ کسی نے

شعر و شاعری پر وحیدؔ عرشی کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزلوں پر سامعین نے داد و تحسین کے وہ پھول برسائے کہ بن پیے ہی نشہ ہو گیا اور نشہ بھی ایسا کہ آخر دم تک نہیں اُترا۔ خود وحید صاحب کا خیال تھا کہ مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزل کے ایک شعر پر ملنے والی داد دو بوتل کا نشہ رکھتی ہے۔ وحید صاحب کے ایک ایک غزل کی سلور جبلی منائی گئی۔ (مطلب پچیسویں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مرتبہ غزل پڑھوانے سے ہے)۔ داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ واہ واہ کا نشہ سر نہیں چڑھے گا ایسا ناممکن۔ نشہ چڑھا اور ایسا چڑھا کہ مرتے دم تک نہیں اُترا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مرتے مرتے بھی غزل کا آخری مطلع کہتے گئے۔

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے
دور تک جستجو کے سائے گئے

وحیدؔ عرشی کے اشعار کا مطالعہ کرنے پر صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں غور وفکر کی شاعری تھی۔ انہوں نے غزل میں ترنم اور غنائیت پر زور دیا۔ زندگی کے جبر وآلام عصر حاضر کا عذاب آ گہی۔ تنہائی کے احساس کا ہنر غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کا عکس بھی ان کی غزلوں میں دکھائی دیتا ہے۔

ارماں کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤ گے بہہ جاؤ گے اشکوں میں
بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت
راہ منزل چھوڑ دیتا ہوں سدا میں اس لئے
مل گئی منزل تو جہدِ زندگی مرجائے گی
بحرِ غم دوراں میں اک اک چیز تمہاری پھینک دی میں نے
یاد مگر بن بیٹھی ساحل، ڈوب سکی نہ موجوں میں
کیا جانئے کیوں تکتے رہے راہ کسی کی
آنے کا تو وعدہ بھی کیا تھا نہ کسی نے
تیرے گیسو مری الجھن کے خطاوار نہیں
تونے ان کو تو کئی بار سنوارا اے دوست

وحیدؔ عرشی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ وہ بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ بیکار پتھر یا لکڑی کے ٹکڑوں پر غالبؔ اور ٹیگور کی شبیہ اُتار دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ پروفیسر شاہد اختر نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

"ان کا مقام حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول تھانہ بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی کالج۔ سچ پوچھئے تو وہ ہمارے عہد کے Genius تھے۔ اپنی تہہ در تہہ صلاحیتوں کی بناء پر انہیں چار دانگ عالم میں مشہور

ہونا تھا۔ کاش گردش روزگار نے کچھ اور مہلت دی ہوتی تو ہمارا ادب بھی اس بات پر فخر کر سکتا کہ ہم بھی ٹیگور کی طرح ایک ہمہ صفت فنکار رکھتے ہیں"۔

وحیدؔ عرشی کا خاندانی نام خواجہ وحید الحق تھا۔ ولدیت محمد حنیف اور قلمی نام وحیدؔ عرشی تھا۔ جائے پیدائش نرائن پور (کانکی نارۂ چوبیس پرگنہ) تھی۔ تاریخ پیدائش ۲۷ ستمبر ۱۹۴۳ء۔ جب کہ بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اُردو شعراء (مشتاق احمد) میں ۲۷ دسمبر ۱۹۴۳ء درج ہے۔ آبائی وطن پرتاپ گڑھ (یوپی) تھا۔

شاعری کا آغاز ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ اصلاح کسی سے نہیں لی تھی۔ تعلیمی صلاحیت ایم اے (کلکتہ یونیورسٹی) (اُردو) تھی۔ ۱۹۶۸ء میں گولڈ میڈل کے حق دار ہوئے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں حمایت الغرباء ہائی اسکول کے اسسٹنٹ ٹیچر (۱۹۶۶ء) رہے۔ بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی کے لکچرر رہے (۱۹۸۰ء)۔

منور رانا نے اپنے ایک مضمون میں بتایا ہے کہ وحیدؔ عرشی اُردو کے خاموش مجاہد تھے۔ اُردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ یہ اُردو کی محبت ہی تھی کہ وہ حمایت الغرباء ہائی اسکول کی ۱۵۰۰ روپے کی نوکری کے بجائے بھوانی پور کالج (کلکتہ) میں ۶۰۰ روپے کی غلامی کر رہے تھے۔ دراصل وہ اس غیر مسلم علاقے میں جلتی ہوئی شمع اُردو کو بجھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

کمال جعفری کے ذریعہ ترتیب دیے گئے "یادوں کا زنداں" ۱۵ غزلوں کے بعد ۱۲ قطعات، ۷ مختلف متفرق اشعار اور ۲۴ نظموں کا ذکر ملتا ہے جس میں ۳ پابند نظمیں ہیں۔ بچھڑی ہوئی ماں کے نام، نوحہ اور محبت۔ بقیہ ۲۱ آزاد نظمیں ہیں۔ ان میں گمنام پھول، فسادٔ مرہم، انتظار، ٹیٹو (تم بھی) اور منزل کافی مشہور ہوئیں۔

وحیدؔ عرشی نے ایک مقامی مشاعرے میں اپنی پسندیدہ ایک نظم پڑھی تھی۔ نظم کا تاثر ایسا تھا کہ ذہن کے نہاں خانے میں وہ نظم محفوظ ہو کر رہ گئی۔ یادوں کا زنداں میں بسیار تلاش کے بعد بھی اس نظم کا تذکرہ نہیں مل سکا۔ ایسی تاثراتی نظم کمال جعفری کے مرتب کردہ مجموعہ کلام میں درج ہونے سے رہ گئی۔ کمال صاحب سے ایسی چوک کیسے ہوگئی جب کہ مجموعۂ کلام ترتیب دیتے وقت ان کا رابطہ گھر کے لوگوں سے تھا۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کو یادداشت کے سہارے محفوظ کر لیا جائے۔

رہ گزر ہی رہ گزر ملی جدھر جدھر گئے
دائرے کی طرح ہم بنے، بڑھے، بکھر گئے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سیل کی طرح کبھی جو تری سمت ہم بڑھے
پاؤں چومنے لگے سمٹ سمٹ کے فاصلے
پھر نہ جانے کیا ہوا کہ خود ہی ہم ٹھہر گئے
رہ گزر ہی رہ گزر ملی جدھر جدھر گئے
فکر کی وہ دھوپ تھی کہ روح تک جھلس گئی
سر برہنہ یاد تیری چھاؤں کو ترس گئی
چاہ تھی کہ راہ میں گھنا کوئی شجر ملے
رہ گزر ہی رہ گزر ملی جدھر جدھر گئے
جانے کس کی آرزو تھی جانے کس کا انتظار
جانے کس کی یاد کی تپش سے دل تھا بے قرار
پھر یہ کیسی آرزو کہ کوئی ہم سفر ملے
رہ گزر ہی رہ گزر ملی جدھر جدھر گئے

آج وحیدؔ عرشی ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی یاد برابر ہمیں ستاتی رہتی ہے۔ خاص کر کانکی نارہ اور جگتدل کی ادبی محفلیں تو ان کے بغیر سونی سونی سی لگتی ہیں۔ ان کے سانحۂ انتقال پر (۳ فروری ۱۹۸۶ء) اہل قلم حضرات نے اپنے اپنے ڈھنگ سے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

کھلنا (بنگلہ دیش) سے محمد ابراہیم ناشادؔ نے قطعہ لکھا ہے۔

غم دیدہ و نم دیدہ ہے موضوع ہر گفت و شنید
عیش و طرب کا ذکر نہیں ہونٹوں کے نزدیک و بعید
جس محفل میں جاتا ہوں ناشاد یہی سنتا ہوں صدا
آہ وحیدؔ آہ وحیدؔ آہ وحیدؔ آہ وحیدؔ

دلؔ عرفانی نے غزل کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

غم و اندوہ کا عالم نہیں لکھا جاتا
دوست دیرینہ کا ماتم نہیں لکھا جاتا
سانحہ دل پہ وہ ٹوٹا ہے کہ دل ہی جانے
مجھ سے یہ حادثۂ غم نہیں کہا جاتا

نور اقبال نے ''اداکار'' نام سے ایک نظم پڑھی۔

پھر وحیدؔ عرشی کی تعزیت کے لئے
غمگساروں نے مجمع لگایا یہاں
باتیں ہونے لگیں ان کے اوصاف کی
وقت نے غافلوں کو جگایا یہاں

زماںؔ قاسمی نے قطعہ لکھا ہے۔

آئی کیسی ہوا پھر تری یاد کی
زخم رسنے لگا بڑھ گئی بے کلی
آج عرشی نہیں بات جمتی نہیں
ایسے میں اب بھلا کیا لکھے قاسمیؔ

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وحید عرشی: جستجو آشنا شاعر

.................احمد وکیل علیمی (کانکی نارہ)

مغربی بنگال کی سرزمین کانکی نارہ، چوبیس پرگنہ (شمال) ادبی اعتبار سے اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک زرخیز علاقہ ہے۔ وحید عرشی کا تعلق کانکی نارہ سے ہے۔ شعروادب، درس وتدریس اور فکروفن کے گلزار میں وحید عرشی شمشاد قد شخصیت کے حامل تھے۔ وحید عرشی ایک معتبر، معزز، مخلص اور محترم انسان تھے۔ ان کی ذات اپنے آپ میں ایک محفل، ایک انجمن اور ایک پراسرار تنہائی تھی۔ کوئی بھی عہد آفریں سنگ تراش اگر وحید عرشی کا مجسمہ بناتا تو اسے سنگ مرمر کے بجائے خوب صورت غزلوں، نظموں، شیریں الفاظ، دھیمے لہجے اور مترنم آواز کا پیکر تراشنا ہوتا کہ وحید عرشی ایک پرکشش خاموشی، ایک دلدوز صدا، ایک دل آویز ترنم اور ایک سنجیدہ لہجے کا نام ہے۔

وحید عرشی ان شعراء میں سے نہیں تھے جو دوسروں کو درس وتلقین کرتے اور خود عمل سے چشم پوشی کرتے ہیں، جن لوگوں نے وحید عرشی کے مجموعۂ کلام ''یادوں کا زنداں'' کا مطالعہ کیا ہے وہ بغیر کسی قیل و قال کے ان کے قول وفعل کی صداقت کے گواہ بن جاتے ہیں۔ رفتگاں میں وحید عرشی کی موت اگر ایک عظیم شاعر کی موت نہیں تو ایک مخلص، بے ضرر اور دردمند انسان کی موت ضرور قرار دی جاسکتی ہے۔ وحید عرشی کی موت نے ہم سے بیک وقت تین اشخاص کو چھین لیا۔ اول ایک اچھے اور لائق استاذ کے علاوہ اشعار کی تشریح کے معاملے میں ان کو بلاتردد لقن ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ دوئم بقول منور رانا:

''پلاسٹک کے بے مصرف ٹکڑوں سے بٹن بنالینا اور تیسرا وصف غالب کی تصویر بنالینے والی فنکارانہ صلاحیت خدا نے انہیں ودیعت کر رکھی تھی''۔

ایسا شاعر جب فقط ۴۷ برس کی عمر میں داغ مفارقت دے جائے تو یقیناً اس کے بے موت مرنے پر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور وکیل اختر مرحوم (کلکتہ) کا یہ مصرعہ لب پر آجاتا ہے:

''مجھے بے موت سے مرنے سے بچالو''

۱۵ غزلوں، ۲۴ نظموں اور قطعات ومتفرق اشعار پر مشتمل ''یادوں کا زنداں'' کو کمال جعفری نے ترتیب دیا ہے۔ مجموعہ کلام اس بات کا شاہد ہے کہ وحید عرشی خوب صورت نظموں کے ساتھ دلآویز اور مترنم غزلوں کے خالق بھی تھے۔ بلاشبہ وحید عرشی کی شاعرانہ نظامت اور لطافت کو ایک مقام حاصل ہے۔ شاعر کسمپرسی کی

حالت میں رہا ہو یا حالات تعیش میں، حسن سے مرعوب ہونا اور نظروں کے تصادم سے دل میں گدگدی محسوس کرنا، فطری تقاضا ہے لیکن نظروں سے متصادم ہونے میں شاعری کی کیفیت کبھی کبھی یوں ہو جاتی ہے:

نظروں کے تصادم پہ میں اک پل کو ہنسا تھا
اک عمر رلایا مجھے اک پل کی ہنسی نے
کیا جانے کیوں تکتے رہے راہ کسی کی
آنے کا تو وعدہ بھی کیا تھا نہ کسی نے
ترکِ تعلق سے اک میرا دل ہی نہیں زخمی
تیر ہوئے ہی ہوں گے تیرے سینے کے پار بہت

وحید عرشی کا زخمی دل بھی حسن کی دل کشی اور محبوب کی دل لگی سے معمور تھا۔ یہی وہ جذبہ ہے جو زخمی دلوں کا مرہم بن کر اسے زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتا ہے اور فارغ البالی کی شان عطا کرتے ہوئے یا اس کی تکذیب کرتا ہے کیوں کہ عقل مند لوگوں کی عقل ''لب ودندان واشتن'' ملاحظہ فرمائیں:

پاس ہوتے ہیں وہ یا دور کہیں ہوتے ہیں
وہ ہر اک وقت میرے دل میں مکیں ہوتے ہیں
شب کی تنہائی ہو اور یاد کسی کی پیہم
درحقیقت وہی لمحات حسیں ہوتے ہیں

غم والم کو شاعر تنہائی میں شدت سے محسوس کرتا ہے اور تنہائی، اس کے غم کے بوجھ کو کم کرنے کا ایک ذریعہ بھی بنتی ہے لیکن جب محبوب کی یاد رگ وپے میں سرایت کر گئی ہو تو یاد، تنہائی کا ساتھ نہیں چھوڑتی بلکہ ایسے حالات میں یاد، تنہائی کی رفیق بن جاتی ہے۔

لٹ گیا اب تو متاع غم تنہائی بھی
کس ادا سے تیری یادوں کو پکارا اے دوست
ایک تنہائی تھی وہ بھی نہ ہوئی مجھ کو نصیب
کیوں تیری یاد کی پرچھائیں میرے ساتھ چلی

وحید عرشی، پرویز شاہدی جیسے ترقی پسند شاعر کے قائل تھے۔ پرویز شاہدی نے کہا تھا:

کتنے اصنام ناتراشیدہ
پتھروں میں ہی کسمساتے ہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسی خیال سے مطابقت شعر وحیدؔ عرشی کے یہاں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

صنم ہزاروں نئے پتھروں کے اندر ہی
تڑپ رہے ہیں ابھی فن آزری کے لئے

وحیدؔ عرشی عشق میں غرض اور مصلحت کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتے ہیں:

جہاں پہ عشق کو سودائے غرض ہوا ے وحید
وہی مقام ہے اُلفت میں خودکشی کے لئے

وحیدؔ عرشی کا دل ایک دردمند دل تھا لیکن وہ درد کی نمائش نہیں کرتے تھے۔ البتہ خوشی اور تفریح میں تعیم کی نظیر ثابت ہوئے تھے۔ چھوٹی بحر میں فرماتے ہیں:

جو درد سے بھر آئے   یہ سچ ہے وہی دل ہے

زندگی میں جہد اور جستجو ہی زندہ رہنے کا ذریعہ ہیں۔ زندگی کے طویل سفر میں اگر کچھ دور چل کر منزل کی تلاش میں مصائب اور دشواریوں سے بغل گیر ہونے سے انسان میں عزم و استقلال پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ زندگی کو دراصل حرکت و گردش میں دیکھنے کے قائل ہیں:

راہ منزل چھوڑ دیتا ہوں سدا میں اس لئے
مل گئی منزل تو جہد زندگی مرجائے گی

''یادوں کا زنداں'' کی ۲۴ نظموں میں وحیدؔ عرشی کا بلاشبہ ایک منجھے ہوئے نیرنگ ساز فنکار کی طرح سامنے آتے ہیں۔

موت سے چند روز قبل انہوں نے یہ مطلع کہا تھا:

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے
دور تک جستجو کے سائے گئے

اس طرح وہ خود اپنے شعر کی تفسیر بن گئے۔ آج بھی درس و تدریس اور شاعری میں صداقت کی بات نکلتی ہے تو وحیدؔ عرشی بے ساختہ یاد آتے ہیں اور ادبی محفلوں میں نگاہیں تلاش میں لگ جاتی ہیں مگر یہ تلاش ایک فریب مسلسل بن کر جاتی ہے۔ متلاشی نگاہیں خلا میں کھو کر رہ جاتی ہیں۔ وحیدؔ عرشی صاحب نے اس کیفیت کو خوب محسوس کیا ہے:

کہاں تلاش کروگے وہ زندگی عرشی
جو آ کے کھوگئی چوراہے پہ گلی کی طرح

وحید عرشی: غم حیات کا شاعر

محمد ایوب انصاری...

انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ Man lives in deeds not in years اس کا بھرپور اطلاق انگریزی ادب کے عہد ساز شاعر John Keats پر ہوتا ہے جس نے اپنی زندگی کے محض ۳۰ برسوں میں اپنی شہرۂ آفاق رومانی نظموں (Romantic Sonnets) کے ذریعہ انگریزی ادب کے Romantic Poets میں ایک امتیازی مقام بنایا اور انگریزی شاعری کو اپنے خاص لب و لہجہ سے متاثر کیا۔ کچھ ایسے ہی المناک حالات مغربی بنگال کے معتبر شاعر وحید عرشی کے ساتھ بھی پیش آئے جن کے ساتھ زندگی نے وفا نہیں کی لیکن وحید عرشی نے اس کم وقفے میں بھی اُردو شاعری کے ساتھ وفا کی۔ انہوں نے بہت کم وقفے میں اُردو ادب میں اپنا مقام بنایا۔

بقول کمال جعفری ''وحید عرشی کی شاعری میں میرؔ کا درد، داغؔ کی سادگی اور غالبؔ کا جدید اندازِ بیان ہے۔ ان کے اشعار ان کی ذہانت، کربِ ذات، حسرت و یاس، جہد زندگی اور خوشی و غم کی ملی جلی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے لہجے کی انفرادیت میں فکر کی بلندی نمایاں تھی جو ایک کامیاب غزل گو کا وصف ہوتا ہے''۔

مسکراتا چہرہ، خندہ پیشانی، چہرے پر سنجیدگی و متانت، بذلہ سنجی، حاضر دماغی، عمیق مطالعہ اور فلسفیانہ اندازِ گفتگو۔ ان تمام اوصاف کو گوندھ کر اگر ایک تصویر بنائی جائے تو یقیناً وحید عرشی کی شاہکار شخصیت سامنے آتی ہے۔ آسمانِ ادب کا یہ ستارہ ۳ فروری ۱۹۸۶ء کو دائمی اُفق پر ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

کانکی نارہ کی سرزمین ادب کی آبیاری کے لئے شروع سے ہی زرخیز رہی ہے۔ یہاں کی ادبی فضا کو بنانے اور سنوارنے میں جہاں صابر گیاوی شاکی صاحب، ارمان شام نگری، حشم الرمضان، وفا سکندرپوری جیسے استاد شعراء کے نمایاں کردار رہے ہیں وہیں وحید عرشی کا بھی امتیازی کردار رہا ہے۔ انہوں نے اپنی گراں قدر تخلیقات سے آنے والی نسلوں کو متاثر کیا نیز مغربی بنگال کے ادبی کینوس پر گہرا اثر چھوڑا۔ حالانکہ وحید عرشی کے یہاں بڑے شاعر ہونے کے تمام تر اوصاف اور امکانات تھے لیکن افسوس کہ زندگی نے انہیں فرصت نہیں دی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وحید عرشی کی پیدائش ۲۷ ستمبر ۱۹۴۳ء کو شمالی چوبیس پرگنہ کی ایک دور افتادہ بستی کانکی نارہ کے ایک ادبی گھرانے میں ہوئی۔ والد محترم عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے۔ گھر کا ماحول تعلیمی اور ادبی تھا لہٰذا ادب سے شغف ہونا فطری تھا۔ علم و ادب سے فطری طور پر وابستہ ہونے کی وجہ سے ذہن درس و تدریس کی طرف مائل رہا اور اسی پیشے کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کی شروعات حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول میں بحیثیت معاون استاد کی اور اُردو شعبہ سے وابستہ ہو کر اپنے علمی استعداد سے اس شعبے کا وقار بلند کیا۔ شاگردوں کے درمیان اپنے مخصوص انداز تدریس اور مشفقانہ عمل کے لئے مشہور رہے لیکن وحید صاحب کو اپنی بے پناہ علمی صلاحیت کا بھرپور احساس تھا لہٰذا بقول علامہ اقبالؔ کے مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے' کے مصداق وحید صاحب بھوانی پور کالج (کلکتہ) میں بحیثیت لکچرر مقرر کیے گئے لیکن کچھ دشواریوں کے باعث وہ سرکاری منظوری نہیں پا سکے اور بغیر تنخواہ کے کئی مہینوں تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر دنوں میں وہ زبردست مالی بحران کے شکار ہو گئے۔ ایسے میں ان کی شاعری کا متاثر ہونا فطری تھا۔ ان کے آخری دنوں کے اشعار میں جا بجا حزن و ملال، بیزاری، کرب، شکایت زمانہ ترک تعلق کے نقش ملتے ہیں۔ معروف شاعر مظہر امام فرماتے ہیں ''وحید عرشی نے ۴۳ سال کی عمر میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے موند لیں۔ یہ عمر دنیا سے رخصت ہونے کی نہیں ہوتی لیکن زندگی جھیلنے کی اذیت بذات خود جاں گسل ہے۔ وحید عرشی کی شاعری میں فرد کا ہی نہیں، انجمن کا غم بھی شامل ہے۔ ان کے فن کے لمس سے دلوں میں تازگی اور توانائی کے چراغ جل اٹھتے ہیں''۔

غم حیات کی کیلیں تھیں دست و پا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے

ایک تنہائی تھی وہ بھی نہ ہوئی مجھ کو نصیب
کیوں تری یاد کی پرچھائیں مرے ساتھ چلی

ان کے اشعار میں میرؔ کی قنوطیت پسندی کی جھلک صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہی دھیما لب و لہجہ، سلگتے غم اور غزل کی ایمائیت۔ وحید عرشی کی زندگی شروع ہی سے المیوں کا شکار رہی۔ زندگی نے انہیں ہنسنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مسرتیں ان سے کوسوں دور تھیں لیکن انہوں نے صبر و استقلال کا دامن بھی نہیں چھوڑا بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ موج حوادث کا سامنا کیا اور زندگی کے جہاد میں عملی طور

پر حصہ بھی لیا۔

راہ منزل چھوڑ دیتا ہوں سدا میں اس لئے
مل گئی منزل تو جہد زندگی مرجائے گی

وحید عرشی کی شاعری میں شکایت زمانہ اور غم روزگار ہمیشہ ساتھ ساتھ دِکھتے ہیں۔ سائنسی دور میں انسانوں کے درمیان تصنع آمیز تعلقات، نفرتیں، رقابتیں، عداوتیں، شکایتیں اور معاشرے بڑھتے ہوئے تشنج نے ان کی شاعری میں غم جاناں کے ساتھ غم زمانہ کو بھی شامل کیا۔

سب کا دل ہے اپنا اپنا، درد ہے سب کا اپنا اپنا
اپنی کہانی کیوں لے بیٹھے عرشی ایسے لوگوں میں
عجیب شام ہے بیمار کی ہنسی کی طرح
کٹے گی آج کی شب بھی کئی صدی کی طرح
ہر ایک شخص ہے محتاط اس قدر عرشی
کہ اپنے آپ سے ملتا ہے اجنبی کی طرح

وحید عرشی صاحب دوستوں کے درمیان صحت مند تعلقات کے قائل تھے۔ انہیں تصنع سے نفرت تھی۔ سادہ لوح تھے اور عیاری سے پاک تھے اس لئے لوگوں پر بہت جلد بھروسہ کر لیا کرتے تھے اور جب انہیں لوگوں سے ریاکاری ملتی تھی تو نشتر کی صورت میں ان کی شکایت شعر کے قالب میں ڈھل کر آ جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی مختصر زندگی میں بے شمار غم سہے لیکن بڑی خودداریت کے ساتھ اس کا اظہار کیا۔ وہ کسی کا احسان لینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اندر اندر گھٹتے رہتے تھے لیکن وضع داری کو سینے سے لگائے رکھتے تھے۔

قبر تک کاندھا بدلتے ہی چلے
دوستوں پر موت بھی بھاری ہوئی

وحید عرشی خود بھی بہت اچھے انسان تھے اور اچھے انسانوں کی قدر کرتے تھے۔ حسن سلوک کا معاملہ ہو یا خلوص و عقیدت کا۔ ہر معاملے میں وہ بے مثال تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک شریف النفس، سنجیدہ اور کم گو انسان تھے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ مزاح سے خالی تھے۔ ان کے مزاح میں ابتذال کی بجائے اعلیٰ ذوق تھا۔ وہ بیحد حاضر دماغ تھے اور گفتگو کے دوران اپنے نکتے کی حمایت میں برمحل شعر کا حوالہ دیتے تھے۔ کتابوں کا مطالعہ ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ شاید کتابوں کے وسیع مطالعہ کے باعث زبان و

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بیان پر ان کو غیر معمولی قدرت تھی۔ معمولی موضوع کو بھی اپنی قادرالکلامی سے اور اپنے منفرد اندازِ بیان سے غیر معمولی بنا دیا کرتے تھے جو ان کا اپنا حصہ تھا۔

وحید عرشی غزل سے خصوصی طور پر وابستہ ہوئے اور اسی کو اپنی شاعری کا خاص وسیلہ اظہار بنایا۔ اُردو کے غالباً سبھی موقر جریدے میں ان کی غزلیں شائع ہوئیں۔ ان کی شاعری ابتدائی دور میں خالص رومانی رہی اور روایتی انداز میں حسن و عشق کے محور پر رقص کرتی رہی۔

تیرے گیسو مری الجھن کے خطاوار نہیں
تو نے ان کو تو کئی بار سنوارا اے دوست
لٹ گئی اب تو متاع غم تنہائی بھی
کس ادا سے تیری یادوں نے پکارا اے دوست

ان کی شروع کی شاعری میں Romantic Feelings بہت شدید تھا۔ اس دور کی غالباً سبھی غزلوں میں عشق کی واردات قلبی کا احساس صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

چھا گیا مرے مقدر پہ اندھیرا اے دوست
تو نے شانوں پہ جو گیسو کو بکھیرا اے دوست

پھر نئے دور کی کروٹوں نے ان کی شاعری میں تبدیلی پیدا کی۔ نئی تشبیہات، تلمیحات، نئی تراکیب ان کی شاعری میں بھی نظر آنے لگیں۔

میں ہر دم نئے تولئے میں سموکر
تمہارے بدن کی مہک رکھ رہا ہوں

حسن و عشق کے تجربے کو جس خوب صورت انداز میں انہوں نے پیش کیا ہے یقیناً قابل ستائش ہے۔ بعد میں وحید عرشی رفتہ رفتہ زندگی کے سنجیدہ موضوعات کی طرف گامزن ہوئے۔ گہرے مطالعے اور عمیق مشاہدے نے ان کے کلام میں موضوعاتی تنوع پیدا کیا۔ ان کی شاعری میں پختگی آنے لگی۔ بعد میں ان کی شاعری روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج بن گئی جس میں دونوں رنگ ایک خاص توازن کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ ان کی شاعری میں تجربے کی حدت، احساس کی شدت، حسن و عشق کا لمس، داخلیت، خارجیت، یاسیت اور کہیں کہیں پر رجائیت کا توانا احساس بھی ملتا ہے۔

مشہور شاعر معین اعجاز فرماتے ہیں:

''اتنا اچھا شاعر، اتنی کم عمر میں ہم سے رخصت ہوگیا۔ اس سے بڑی بدقسمتی کی بات اور کیا ہوسکتی

ہے۔ وہ بلاشبہ ایک خوش فکر شاعر اور بہت ستھرے ہوئے ذوق کے مالک تھے''۔

ان کے متعلق مشہور شاعر و ادیب منور رانا فرماتے ہیں:

''وکیل اختر اور مظفر حیدری کے بعد وحید عرشی کی موت تیسری دردناک موت ہے۔ وہ اُردو کے سچے خادم تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی نمائشی چادر نہیں اوڑھی، کوئی ادبی دُکان نہیں سجائی، کسی اکاڈمی کے آگے دست طلب نہیں پھیلائے۔ ان کی تخلیقوں نے کتابت یا طباعت کی بھیک نہیں مانگی بلکہ وہ بانسری کی ایک میٹھی دھن تھے۔ وہ اس دلچسپ کتاب کا حصہ تھے جس کو اندر اندر دیمک لگ گئی تھی جس کی دفتی سے جلد اکھڑ گئی تھی''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وحید عرشی ایک باکمال شاعر تھے۔ وہ فن کی باریکیوں کا ادراک و شعور رکھتے تھے اور زبان کے نشیب و فراز سے آشنا تھے۔ جوٹ ملوں کے پسماندہ ماحول میں پلنے کے باوجود بھی وحید عرشی کے لئے شعر سازی کے ہنر میں ایک دسترس حاصل کرنا کسی بھی صورت میں ایک معجزہ سے کم نہیں۔ وہ شعر کے عروضی مطالبات اور فنی تقاضوں سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا سیاسی شعور بیدار اور سماجی حسِ تیز تھی۔ طالب علمی کے دور سے لے کر معلّمی کے طویل عرصے تک انہیں انگنت سماجی، سیاسی اور معاشی بحران سے گزرنا پڑا تھا لیکن ہر فکر کو دھویں میں اُڑاتا ہوا میدانِ شعر کا یہ مسافر ہنستا کھیلتا منزل کی طرف بڑھتا رہا اور اپنے استقلال کے بل بوتے پر ادب میں اپنا مقام حاصل کرسکا۔

نمونۂ کلام:

ہزاروں قدآور آئینے ہیں
مگر ترسا ہوں چہرہ دیکھنے کو
بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت
وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے
دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے میری پلکوں میں
کتنے تاج محل ڈوبیں گے پانی کی ان بوندوں میں
تمہارے روئے منور کی ضو میں ڈوب گیا
فلک پہ چاند جو نکلا تھا ہمسری کے لئے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہر ایک شخص ہے محتاط اس قدر عرشی
کہ اپنے آپ سے ملتا ہے اجنبی کی طرح

لوگ تو پیاس بجھاتے ہیں چلے جاتے ہیں
اور دریا ہیں کہ چپ چاپ رواں رہتے ہیں

کیسے سناؤں غم کی کہانی سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے کہ جاؤ حال کو ہے انکار بہت

کس کے جنونِ شوق کا چرچا ابھی سے ہے
سمٹی ہوئی جو وسعت صحرا ابھی سے ہے

کیا جانے کیوں تکتے رہے راہ کسی کی
آنے کا تو وعدہ بھی کیا تھا نہ کسی نے

ایک ہشت پہل ہیرا وحید عرشی

ہمدمؔ نعمانی

وحید عرشی کی شخصیت میرے نزدیک ایک ہشت پہل ہیرے کی ہے اور اس کے ہر پہلو الگ الگ روشنی اور شناخت رکھتے ہیں۔ موصوف ایک نمائندہ شاعر، منفرد نثر نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ پینٹنگ اور آرٹ سے دلچسپی رسمی نہیں بلکہ عملی ہے۔ بنگلہ زبان وادب پر گہری نظر اور فن موسیقی کے باریک بیں۔ علاوہ ازیں ایک فرض شناس اور کامیاب مدرس جو اپنے شاگردوں پر علم عرفان کے موتی ہی نہیں لٹاتا بلکہ انہیں درس وتدریس کے علاوہ ان کے اندر خود اعتمادی کا جوہر بھرتا ہے۔ پھر کارزارِ حیات میں عملی طور پر قدم رکھنے کا پیغام دیتا ہے۔ جس کی زندہ مثال ڈاکٹر پروفیسر شاہد اختر اور ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی جیسے ہونہار شاگرد ہیں۔ اس طرح نہ جانے کتنے اصنام ناتراشیدہ کو بت طناز بنا ڈالا۔ لیکن حالات کے انتشار اور سیمابی طبیعت نے کسی ایک مرکز پر قیام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ پلاسٹک کے ٹوٹے ٹکڑے سے بٹن بنا لینا۔ لکڑی کے کندے پر غالبؔ، اقبالؔ اور ٹیگور کی شبیہ اُتار لینا، فرصت کے لمحات میں وائلین کے سروں سے خود کو ہم آہنگ کر لینا ایک مکمل فنکار ہونے کا بین ثبوت ہے۔

وحید عرشی کی ادبی زندگی کا آغاز زمانۂ طالب علمی سے ہوا۔ ۶۰ کی دہائی میں ادبی اُفق پر نمودار ہوئے۔ جلد ہی ایوانِ ادب پر اپنا دستخط ثبت کر دیا۔ کلکتہ ونواح کی ادبی مجلسوں میں شرکت بھی ہوتی رہی مگر اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہہ لیں اپنی ۴۲ سالہ مختصر حیات میں شعری مجموعہ شائع کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ بقول مظہر امام ''یہ عمر دنیا سے رخصت ہونے کی نہیں ہوتی لیکن زندگی کو جھیلنے کی اذیت بذاتِ خود جاں گسل ہے۔ شاعر خواہ لہولہان ہوا گر اس کی شاعری دوسروں کے زخموں کا مرہم نہیں بنتی تو بے توقیر ہو جاتی ہے''۔

''وحید عرشی کی جواں مرگی سے اردو ادب کا نقصان ہوا۔ جس کی تلافی مشکل ہے۔ ۱۹۹۱ء میں کمال جعفری نے ان کا شعری مجموعہ ''یادوں کا زنداں'' شائع کیا جس میں پندرہ غزلیں، ۱۴ نظمیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وحید عرشی کے بکھرے فن پاروں کو تلاش کیا جائے۔ سردست یادوں کا زنداں کی روشنی میں ہی گفتگو کا جواز فراہم ہے۔

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شعری مجموعے کے سرسری مطالعے سے ذہن میں جو پہلا سوال ابھرتا ہے کہ کیا وحید عرشی صرف غم حیات کا شاعر ہے اور اس کے دست و پا میں کیلیں جڑی ہیں اور تمام عمر صلیب پر لٹکا ہوا ہے؟ ذہن یہ ماننے پر تیار نہیں ہوتا ہے۔ ہاں وحید عرشی اپنی پشت صلیب ڈھونڈتا ہوا نظر ضرور آتا ہے اور وہ یادوں کی صلیب ہے جو شاعر کا سرمایۂ حیات ہے۔ شاعر نے اپنی شعری کائنات کی تجسیم نہایت ہی صناعی کے ساتھ کی ہے۔ تجربے اور مشاہدے کی آنچ نے اس کے فن پاروں کو کندن بنادیا ہے۔ زمانے کی ستم انگیزیاں اور کربناکیوں کو خوب خوب آشکار کیا ہے۔ تازیانۂ احساس سے معاشرے کو بیدار کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ ایوان شاعری کے در و بام حقائق نگاری سے آراستہ کیے ہیں۔ غم جاناں اور غم دوراں کے حسین امتزاج نے زندگی کا حوصلہ بخشا ہے اور یہی سادگی و پرکاری ہمیں میر کی آپ بیتی طرح جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی غزلیں اشاریت' سلاست فکر انگیزی اور سوز گداز کے عناصر اربعہ سے مزین ہیں جو ہمیں ایک نئے جہان کی سیر کراتی ہیں۔ مگر زمینی سچائی روشن رہتی ہے۔ شاعر کی خودداری کہیں سے مجروح نہیں ہوتی کہیں کہیں طنز کی آمیزش نے غزلوں کا مزہ دوآتشہ کردیا ہے۔

ڈھل گئے دامن احساس کے رنگین نقوش
اس کی آنکھوں کی فسوں سازی پہ ہے کس کی نظر
تیرے دیدار سے اچھا تھا تصور کا سراب
اس نے کچھ بھی نہ دیا اُس نے تو دھوکہ دیا
خوابوں کے حسیں عکس تھے جس راہ میں عرشی
وہ راہ بدل دی ہے تصور کی ندی نے
داغ دل داغ جگر مجھ کو محبت کا صلہ
تجھ کو اے مہتاب لیکن داغ یہ کیسے ملا

دامن احساس کے رنگین نقوش کا برستی برسات میں ڈھل جاتا' چشم فسوں ساز کی پردہ داری اور دیوانگی موردالزام تصور کے سراب پر قانع رہنا' خوابوں حسین عکس کے راستوں میں تصور کی ندی کو بدل دینا۔ محبت کے داغ اٹھانا زندگی کی الم ناکیوں کی داستان ہے جس سے آج کا ہر انسان دوچار ہے اور بچنا محال ہے۔

وحید کی غزلوں میں نشاطیہ عناصر اور رومان کی ایک زیریں لہر ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاعر جب غم دوراں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ پھر نشاط انگیز پہلو اس کے زخموں کا مداوا کرتے ہیں۔ جو زندگی کا ایک

خوش آئند اشاریہ ہے۔

نئے تولیے کی مہک میں سموکر
تمہارے بدن کی مہک رکھ رہا ہوں
تمہارے روئے منور کی ضو میں ڈوب گیا
فلک پہ چاند جو نکلا تھا ہمسری کے لئے
گلوں کو رنگ ستاروں کی روشنی کے لئے
خدا نے حسن دیا تم کو دلبری کے لئے
اک وہ مہہ کامل ہے
جو پیار کے قائل ہے
ان ادھ کھلی پلکوں کا
ہر دن ہی مہمل ہے
مسکراکر کے پھول برساؤ
چشم میگوں کا جام چھلکاؤ
پھول ہیں منتظر مہکنے کو
عنبری زلف اپنی مہکاؤ
جلوۂ رخ چھپالو آنچل میں
چاند کو اب نہ زیادہ شرماؤ
ان کے جلوؤں کی کہاں تاب نظر کو میری
روبرو کے بھی پردہ نشیں ہوتے ہیں
نظم عالم کا مری ذات سے ہے وابستہ
میری تقدیر سے سب زہرہ جبیں ہوتے ہیں
تم کو پایا تم کو کھویا بات انوکھی اس میں کیا ہے
پر وہ خوشبو چبھ جاتی ہے بس جو گئی ہے بانہوں میں

نئے تولئے میں محبوب کے بدن کی خوشبو سنبھال کر رکھنا۔ محبوب کو پاکر کھونا مگر خوشبو کا بانہوں میں بس جانا یہ ایسے حسین لمس ہیں جو شاعر کا انمول سرمایہ ہے۔ شاعر کو محبوب کے جلوؤں کی تاب نہیں لہٰذا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

محبوب روبرو ہو کر بھی پردے میں ہے۔ روئے منور کے ضو میں چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ گلوں کا رنگ اور ستاروں کی روشنی کی وجہ محبوب کا حسن ہے۔ محبوب ایسا مہہ کامل ہے جو پیار کے قابل ہے۔ شاعر کو اپنی ذات پر اتنا بھروسہ ہے کہ کسی کی زہرہ جبینی کا شرف اس کی تقدیر کا خاصہ ہے۔ مذکورہ بالا اشعار میں نشاط و کیف کی ایک سرور آگیں رو ہے اور ایک ستھرا جمالیاتی رچاؤ ہے جس کے ذریعہ شاعر کی ذات اور کائنات دونوں وابستہ ہے۔

وحید عرشی حیات کے مثبت قدروں کے شاعر تھے۔ جدوجہد ان کا شیوہ رہا۔ حرکت و عمل ان کا مشن رہا۔ سفر کو وسیلۂ ظفر بنایا۔ لیکن سفر کے مصائب کا شکوہ نہیں کیا۔ منزل کی آرزو بھی نہیں کی اور مسلسل سفر کیا۔ مگر سفر میں درپیش افتاد کا مقابلہ مردانہ وار کیا۔

راہ منزل چھوڑ دیتا ہوں ہمیشہ اس لئے
مل گئی منزل تو جہد زندگی مرجائے گی
مثل مرہم گرد راہ پا سے لپٹے تھے مرے
پھوٹتا تھا تری رہ میں پاؤں کا جب آبلہ
نکل پڑا ہے جنوں تھام کر دست وفا
اک اجنبی کا سہارا ہے اجنبی کے لئے
کس کے جنوں شوق کا چرچا ابھی سے ہے
سمٹی ہوئی جو وسعت صحرا ابھی سے ہے

لیکن سفر کے بعد آسودگی بھی ضروری ہے۔ مگر اس سفر میں انہیں صرف مصائب کا ہی سامنا کرنا پڑا اور وحید عرشی کے یہاں ٹوٹنے بکھرنے کا عمل شروع ہونے لگا۔ اردو کے اس خاموش مجاہد نے حمایت الغرباء ہائی اسکول کی پندرہ سو روپے ماہوار کی ملازمت کے بجائے بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی کی معمولی چھ سو روپے کے قلیل مشاہرے کا انتخاب محض ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں اردو کی شمع روشن کرنے کے لئے کی تھی۔ رفتہ رفتہ ارباب اقتدار کی بے اعتنائیوں نے اندر سے ٹوٹنے کا سامان فراہم کر دیا جس کا اندازہ ان کی زندگی کے آخری دنوں کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

دل دھڑکتا ہے سر شام خدا خیر کرے
کیا ہوا اس رات کا انجام خدا خیر کرے
عجیب شام ہے بیمار کی ہنسی کی طرح

کٹے گی آج کی شب بھی کئی صدی کی طرح
کہاں تلاش کرو کے گے وہ زندگی عرشی
جو آکے کھوگئی چوراہے پہ گلی کی طرح
کیسے سناؤں غم کی کہانی سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے کہ جاؤ حال کو ہے انکار بہت

وفات سے دس دنوں قبل صاحب فراش شاعر اپنے متعلقین اور احباب کو اپنی خندہ جبینی اور فرشتوں جیسی مسکراہٹ سے تسلیاں دیتا رہا اور حوصلے بلند کرتا رہا اور سر شام مسکراتا ہوا اپنا رخت سفر باندھ لیا اور اپنے چاہنے والوں کو آنسوؤں کے سمندر میں غرق کر گیا۔

وحید عرشی کی نظمیں بھی ایک نئے ذائقے سے آشنا کراتی ہیں۔ جس طرح غزل میں ان کا منفرد اسلوب قائم ہے۔ تقریباً وہی فضا انہوں نے نظموں میں برتنے کی سعی کی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی جدید نظموں کے مزاج سے ہم آہنگ نظمیں، فکری اور فنی اعتبار سے اچھی نظمیں کہلانے کی مستحق ہیں۔ نظم ''ماں'' ایک بیٹے کا خراج عقیدت تو ہے لیکن اس کا رمز اس کا آخری شعر ہے جس میں ماں کو ایک شمع سے تعبیر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

آفتاب چرخ کیا جانے ادائے دلبری
جانتی ہے شمع پروانے جلے یا خود جلی

نظم ''تجلی'' میں صبح نو کی امید افزا بشارتیں دی گئی ہیں۔ ''اقلیت اور فساد'' آزادی کے بعد وطن عزیز کا مرثیہ کے طور پر پڑھے جانے کے لائق ہیں اور ادب عالیہ میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ ''منظر پس منظر'' سیاسی کینوس کے دائرے میں حقائق نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ علاوہ ازیں ''بیٹ ٹو'' زندگی ''منزل'' بے بسی اور ''رہ گزر'' بھی نمائندہ نظمیں ہیں جس میں جدیدیت آشکار ہیں۔

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وحید عرشی ——— کچھ یادیں

محمد شمس الزماں انصاری (کانکی نارہ)

خواجہ وحید الحق کو ادبی دنیا وحید عرشی کے نام سے جانتی ہے۔ ان سے میری ملاقات ۱۹۶۵ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں میں رشی بنکم چندر کالج (نئی ہٹی) میں پری یونیورسٹی سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میرے ہم جماعت دوستوں میں محمد قمر الزماں انصاری، محمد نظام الدین انصاری، ابوالقاسم انصاری وغیرہ تھے۔

خواجہ مجیب الحق، وحید عرشی کے بڑے بھائی تھے۔ W.B.J.E.S کے تحت ان کی تقرری دارجلنگ گورنمنٹ کالج میں بحیثیت فلسفہ کے لکچرر ہوئی تھی۔ ان سے میرے تعلقات بہت اچھے تھے۔ گرمی یا پوجا کی چھٹیوں میں جب وہ گھر آتے تو ملاقات کی رفتار بڑھ جاتی۔

معاف کیجئے گا، میں بہت بہک گیا تھا۔ بات پری یونیورسٹی سائنس کی ہو رہی تھی۔ انگلش کے نصاب میں ایک نظم "Futility" کے عنوان سے شامل تھی۔ یہ نظم میری سمجھ سے باہر تھی۔ ایک دن میں نے پروفیسر مجیب الحق صاحب سے اس نظم کو سمجھنا چاہا انہوں نے مجھے اپنے چھوٹے بھائی خواجہ وحید الحق کے حوالے کر دیا۔ اس طرح میرا رابطہ وحید الحق صاحب سے ہوا۔ پہلے تو انہوں نے "Futility" کے معنی مفہوم سے آشنا کیا۔ پھر نظم کے مرکزی خیال کو پیش کیا۔ نظم کا پس منظر بتلایا۔ جنگ کی ہلاکت خیزی، تباہ کاریاں سب آنکھوں کے سامنے آگئے۔ اس کے بعد نظم کی تشریح کی گئی۔ آج ۴۶-۴۵ برس ہونے کو آئے وہ نظم آج بھی میرے حافظے میں موجود ہے۔ جو آدمی ایک انگریزی نظم کی تشریح اس طرح کر سکتا ہے وہ اردو شاعری میں بھی کمال دکھا سکتا ہے۔ میں سوچنے لگا اور آگے چل کر میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ ان کے گرد اس وقت کے شاعروں کی بھیڑ جمنے لگی۔ ان دنوں وحید صاحب ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو (جن کا انتقال ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو ہوا تھا) پر ایک نظم لکھ رہے تھے۔ یہ نظم انہوں نے مجھے سنائی تھی۔ نظم طویل تھی۔ اس کا تاثر بہت عمدہ تھا۔ ایک بند ذہن میں آواز دے رہا ہے۔

رو رہے ہیں آج ہم پنڈت جواہر لعل کو
آؤ دیکھیں دردِ دل اس کا کہیں رسوا نہ ہو

ایک ہیں ہم ایک ہیں ہر سمت سے آواز دو
صفحۂ نفرت کو خونِ آشتی سے پھر رنگو
دردِ دل اس کا ہوا رسوا تو پھر جینا ہے کیا
ان کی باتیں دل نشیں ہوں رنگ مانند حنا
تا کہ شانِ ہند ہوجائے نہ دنیا سے فنا
اے وحید اقبالؔ کا وہ شعر پھر سے سنا
"مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں"

بعد میں کمال جعفری صاحب کی کتاب "یادوں کا زنداں" جب منظر عام پر آئی تو معلوم ہوا کہ مذکورہ نظم اس کتاب میں موجود ہے۔ میری یادوں کو جیسے پر لگ گئے اور کئی اشعار جو موقع بہ موقع وہ سنا گئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے جھلملانے لگے۔

تم کو پایا تم کو کھویا بات انوکھی اس میں کیا ہے
پر وہ خوشبو چبھ جاتی ہے بس جو گئی ہے بانہوں میں
بحرِ غم دوراں میں ایک ایک چیز تمہاری پھینک دی میں نے
یاد مگر بن بیٹھی ساحل، ڈوب سکی نہ موجوں میں
جاگ پڑے تو گھبرا کر پھر سونا کیا
سپنا ہی تھا ٹوٹ گیا تو رونا کیا
عقل اور دل میں ترے حسن پہ اک بات چلی
کل بہت رات، بہت رات گئے رات ڈھلی

وہ پہلے شاعر تھے جو کلکتہ اور کلکتہ کے باہر، مضافات کانکی نارہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کی آواز اور ترنم اتنا اچھا تھا کہ مشاعروں میں چھا جاتے تھے۔

اردو کی خدمت کا جذبہ دل میں رکھتے تھے۔ ان کا بارہا تذکرہ بھی کیا کرتے تھے۔ جبھی تو کانکی نارہ حمایت الغرباء ہائی اسکول کی ملازمت سے چھٹی لے کر بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی میں اردو کا کلاس لے رہے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہیں ملازمت چھوڑنی پڑی۔ ۱۵۰۰ روپیوں کی نوکری چھوڑ کر ۷۰۰ روپیوں کی ملازمت کرنے لگے۔ اسے کیا کہیں گے؟ یہ اردو سے محبت کا جذبہ نہیں ہے تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پھراور کیا ہے؟

وحیدالحق صاحب ماؤتھ آرگن بہت اچھا بجاتے تھے۔ میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے وحید عرشی صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا مشکل ہے۔ تم ماؤتھ آرگن خرید و بجانا میں سکھادوں گا''۔ اور میں نے اسی وقت ایک ماؤتھ آرگن خرید لیا۔ شروع شروع میں کچھ دشواری ضرور پیدا ہوئی۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہوتا چلا گیا۔ آواز کا زیروبم' لبوں کی جنبش اور انگلیوں کی حرکت سے متعلق بہت ساری باتیں حید صاحب نے بتلائیں۔ رفتہ رفتہ میں بھی ماؤتھ آرگن بجانا سیکھ لیا۔

ہمارے علاقے کانکی نارہ نیا بازار میں داتا بیڑی نام کی ایک دکان ہے۔ دکان ماما کی دکان کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس وقت یہ دکان دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سامنے کا حصہ کھلا ہوا' چائے' پان کے لئے مخصوص تھا۔ پہلے حصہ میں ایک چوکی تھی گویا آرام کی خاطر ایک گوشہ بنایا گیا تھا۔ اسی گوشے میں وحید صاحب' رتن دا اور محلے کے کچھ نوجوان دوستوں کے ساتھ بیٹھتے اور اپنے ماؤتھ آرگن پر کسی پسندیدہ فلم کے گانے چھیڑتے۔ حاضرین گانے کے دھن سن کر وجد میں آجاتے تھے۔

ان کا انتقال ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ محلّہ میں ایک تعزیتی نشست کا اعلان ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شعراء' ادباء کے علاوہ لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ موجود تھی۔ شعراء حضرات نے اشعار کے ذریعہ وحید صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ ان کے ساتھ رہنے والے' اٹھنے بیٹھنے والے جیسے اصغر صاحب' منیر صاحب' وفا صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ مجھے بھی بلایا گیا اور لوگوں کی طرح میری آواز بھرا گئی تھی۔ سچ پوچھئے تو یہ ان کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔ آج بھی جب وحید صاحب کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں۔

سپنا ہی تھا' ٹوٹ گیا ——— وحید عرشی

ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی (جگتدل)

کسی بھی تخلیق میں فنکار کے باطن کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ اگر باطن کا یہ شجر جوہی کا ہو تو جوہی پھول کی خوشبو آئے گی اور گیندے کی لچکتی ڈالیاں ہوں تو اس کے پھول کی خوشبو کو رجنی گندھا کی خوشبو میں نہیں بدلا جاسکتا ہے۔ وحید عرشی کے باطن میں جو لچکتی ڈالیاں ہیں وہ سرخ گلاب کی ہیں۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے کیسی خوشبو آئے گی ———!!! انسان آغاز سے آج تک ہمیشہ امکان کے نئے اور بہتر گوشے کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ یہی جستجو انسان میں حرکت و عمل پیدا کرتا ہے۔ اس جدوجہد کی زندگی میں وحید عرشی بقول منور رانا ———

''بھیک تو بری چیز ہے! اس شخص نے تو کبھی اپنا حق بھی نہیں مانگا۔ اگر اس نے حق مانگ لیا ہوتا تو ایک ٹوٹے سے گھر کے میلے بستر پر اس کی موت کبھی نہیں ہوتی' آکسیجن سلنڈر کے لئے اس کے گھر والے مارے مارے نہیں پھرتے' پروفیسر عبدالرؤف کو کسی سے بچوں کا خیال رکھنے کو نہ کہنا پڑتا۔ اس کی بھتیجیوں کو کان میں برسوں پرانی نیم کے تنکے نہ ڈالنے پڑتے۔ بلکہ سونے کی بالیاں جھولتیں۔ اس کے گھر میں اینٹوں کا بے ترتیب فرش نہ ہوتا۔ قالین ہوتے۔ گھر کی دالانوں میں پھٹی ہوئی چادریں نہ پڑی ہوتیں۔ ریشمی پردے کسمساتے ہوتے لیکن وہ تو ایک پیڑ تھا۔ سایہ دار پیڑ' ایک میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ وہ ایک خوب صورت جھیل تھا جس میں پرندے نہاتے تھے۔ نمازی وضو کرتے تھے اور بچے اپنے لکھی ہوئی تختی دھوتے تھے۔ بھلا جھیل کب کسی سے اپنا حق مانگتی ہے۔ وہ بہت کرتی ہے تو لوگوں کو ان کا عکس اپنے آئینے میں دکھا دیتی ہے'' (زنجیر کھینچ کر وہ مسافر اتر گیا)۔

بیتے دنوں کی یاد جب آئی ہے تو ذہن کے گلیارے میں گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی ہائی اسکول کے زمانے میں کم وبیش ۶ برسوں تک اس جھیل میں اپنی لکھی ہوئی تختی دھویا تھا۔ پرائمری بورڈ پاس کرنے کے بعد میرا داخلہ حمایت الغرباء ہائی اسکول میں ہوا۔ ایک دن سفید چوڑی دار پاجامہ' کھادی کا کرتا جس میں چمکتے ہوئے سفید نگینے کا سنہری زنجیروں والا بٹن' دراز قد' چوڑی پیشانی' بکھرے بال' ہونٹوں پر پان کی سرخی اور جالی دار چپل پہنے لکڑی کے ایک ٹکڑے کو بلیڈ سے تراشتے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوئے خراماں خراماں استاد کلاس کے اندر داخل ہوئے۔ کانکی نارہ میں مقیم میرے دوستوں نے بتایا کہ یہ اردو کے استاد ہیں۔ ان کا نام خواجہ وحید الحق ہے اور ان کو عرف عام میں ''پران'' کہا جاتا ہے۔ ۳۰-۳۲ برس کے گرد اڑ گئے لیکن ان کی شکل وشباہت نگاہوں کے پردے پر اور آواز ______ ''کم بول' بک بک مت کر' کتاب نکال اور پڑھ' میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

وحید عرشی نے زندگی کے تپتے ریگ زار میں سفاک معاشرے کی گھٹن کو محسوس کیا۔ منہ زور ہواؤں کے لگام کو پکڑنے کی کوشش کی۔ حرص وہوس کی دنیا سے مصالحت کو خودداری کی موت سمجھا اور خون جگر سے وضو کر کے ادب کے حرم میں نماز پڑھی۔ ان کی فکر بانجھ نہیں تھی کیوں کہ بانجھ فکر درجہ اول کی تخلیق خلق نہیں کرتی ہے۔ حالانکہ تمام عمر وحید عرشی کی آنکھوں میں اُداس خوابوں کے بگولے اڑتے رہے اور وہ اندر ہی اندر مانند برف پگھلتے رہے۔ نتیجتاً فکر نے جو فرغل زیب تن کیا وہ میر کی طرح دامن دل کو انبساط کا موقع کم اور ملال کا داغ زیادہ دیتا ہے جس سے دل کا نگر دھیرے دھیرے اجڑتا ہے لیکن ویران نہیں ہوتا!!

آنے کا بھی وعدہ تو کسی نے نہ کیا تھا
پھر کس کے لئے راہ گزر دیکھتے رہے

نالوں کو چرخ' اشکوں کو خاک اور مجھے جنوں
اس دل کو تم نے چھوڑ دیا کس کے آسرے

قبر تک کاندھا بدلتے ہی چلے
دوستوں پر موت بھی بھاری ہوئی

دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے میری پلکوں میں
کتنے تاج محل ڈوبیں گے پانی کی ان بوندوں میں

عملی زندگی میں وحید عرشی کی راہوں میں حاسدوں نے کانٹے بچھائے جس سے ان کے نرم تلوے لہولہان ہوئے لیکن ان کے چہرے پر کرب کی لکیریں لوگوں نے تبسم کی شکل میں دیکھا۔ اس لئے زندگی کے بادباں کو منجدھار میں ٹوٹنے کا غم وحید عرشی کے تراشیدہ شعری پیکروں میں اس قدر زیادہ ہے کہ قاری کا دل بھی ملول ہو جاتا ہے لیکن اس ملال کے بطن سے صبر کے قطرے بھی ٹپکتے ہیں جو زندگی کے اگلے پائیدان پر قدم رکھنے کی جوت جگاتے ہیں۔ یہی جوت ان کو زندگی کے تپتے ریگ زاروں میں آبلہ پائی کے باوجود مسافت پر اکساتی ہے۔ عصری نفوس ونقوش فنکار کو اندر اندر کھرچتے

رہے ہیں جو تخلیقیت کے ہنر کو مہمیز کرنے کے وسیلے ہیں۔ وحید عرشی نے پوری زندگی اس مرحلے کو طے کیا ہے نتیجتاً فکر کے جو آب دار موتی ان کے ہاتھ لگے ان کو شعر کی لڑیوں میں یوں سمو دیا کہ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا

اہل خرد کی بستی میں یہ کھیل تو کھیلے جاتے ہیں
آج مگر دیوانے نے دیوانے پہ پتھر پھینک دیا

یاد کے شکستہ طاق پر وحید عرشی کی شمع حیات جلتی رہی اس لئے یاد کی اپسرائیں جب پاؤں میں جھانجھر باندھ کر زیست کے آنگن میں محوئے رقص ہوتی ہیں نوجوانوں کی منڈیر پر نئے چراغ جگمگانے لگتے ہیں۔ لہٰذا تلازمہ یاد وحید عرشی کے شعور اور لاشعور دونوں کا جزو لاینفک ہے جو اپنی نیرنگیوں کے جلوے دکھاتا ہے۔ ماضی کی کڑوی اور رسیلی یادوں کے درمیان شب کے آخری پہر میں جب چاند کا داغ لہو بن کر ٹپکتا ہے' نجم سحر جب آنکھوں میں آنسو کے قطرے بن جاتے ہیں۔ تپتی کرن کے بوسے سے کلیاں جھلس جاتی ہیں' اس وقت وحید عرشی کے دل میں ایک انجانا سا درد دامن احساس کے شکن کا سبب بنتا ہے۔ یہ شکن احساس دلاتا ہے کہ غم دوراں کے پگھلتے ہوئے انگاروں سے ارمان کے سانچے کو نہیں سجایا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان کے شعری پیکروں کی پلکوں کے پیچھے آنسوؤں کا سمندر ہوتا ہے لیکن اس سمندر میں کبھی کبھی خواب کے جزیرے دکھائی دیتے ہیں جس پر امید کی شمع روشن رہتی ہے۔ ایسا اس لئے کہ وحید عرشی کے شعری پیکروں کو اس حقیقت کا تیقن ہے کہ مایوسی اور اداسی کا پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا ہے بلکہ اس سے دلوں کے دیے مزید بجھ جاتے ہیں۔ یہی پرامیدی وحیدہ عرشی کی شاعری کو یاسیت کی پناہ گاہوں میں رقت آمیزی کی صورت اختیار نہیں کرنے دیتی۔ اس چھوٹے سے مجموعے میں یاد کے موضوع پر کل ۱۱۵ اشعار رقم کیے گئے ہیں جن میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت

بحر غم دوراں میں اک اک چیز تمہاری پھینک دی میں نے
یاد مگر بن بیٹھی ساحل ڈوب سکی نہ موجوں میں

اے چناری یاد ہے مجھ کو تیرا درسِ فنا
مونسِ غم نے یہیں باندھا تھا پیمانِ وفا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ارماں کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب تم یاد آؤ گے بہہ جاؤ گے اشکوں میں
مرجھا نہ سکا یاد کی شاخوں کا کوئی پھول
اتنا تو کیا ہے میری آنکھوں کی نمی نے

زمانی وقوع کی بازآفرینی کے دوران ان کی نظموں میں متن برائے نام اور موسیقیت کا ایک بے چین سمندر کروٹ بدلتا رہتا ہے۔ جس میں لفظی نظام بہت مربوط ہے۔ وحید عرشی کی شاعری میں تخلیقی ابعاد ہے لیکن موضوع کی کشادگی کا دامن تنگ ہے۔ ایسا اس لئے کہ اتنی کم مدت میں تمام تخلیقی امکانات اپنے جوہر نہیں دکھائے۔ یقین ہے کہ اللہ نے ان کو مزید حیات بخشی ہوتی تو وہ اس میدان کے مردِ مجاہد ہوتے کیوں کہ ان کو زبان پر مکمل دسترس حاصل تھا نیز تخلیقی وفور ان کے یہاں سلگتا نہیں بلکہ شعلوں کی طرح لپکتا ہے۔ خوش آہنگی ان کے کلام کا زیور ہے۔ انہوں نے زبان کی لطافت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا' الفاظ کو تخلیقی توانائی عطا کرنے اور پرانے لفظوں میں معنوی جہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے کلام میں دبیزیت نہیں ہے جس کے باعث فوری طور پر قابل فہم ہے۔ حالانکہ ان کی شاعری نے اس وقت اپنا بال و پر کھولا جب جدیدیت کا غلغلہ پورے شباب پر تھا اور تخلیق کے جدید تقاضوں کی پیروی شاعری کی سند تھی۔ لہٰذا یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کا جھکاؤ کلاسیکیت کی طرف زیادہ تھا۔

ان کے جلوؤں کی کہاں تاب' نظر کو میری
روبرو ہو کے بھی وہ پردہ نشیں ہوتے ہیں
عقل اور دل میں تیرے حسن پہ اک بات چلی
کل بہت رات بہت رات گئے رات ڈھلی
میت کو میرے فکر کفن اب نہیں رہا
مجھ کو غبارِ رہ پہ بھروسہ ابھی سے ہے
داغ دل' داغ جگر مجھ کو محبت کا صلہ
تجھ کو اے مہتاب لیکن داغ یہ کیسا ملا

مذکورہ اشعار میں خود کلامی کے عنصر کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ چھوٹی بحر کی شاعری پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔ وحید عرشی اس پل صراط سے گزرنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔

جو درد سے بھر آئے
یہ سچ ہے وہی دل ہے
اک شوق تن آسانی
آسان بھی مشکل ہے

فنکار کے سینے میں خواب دفن رہتے ہیں۔ وحید عرشی کی قسمت کی لکیروں نے ان خوابوں کی تعبیر نہیں دی۔ لہٰذا حالات کی ستم ظریفی یعنی لاحاصلی کا غم' منفی اور مہلک احساسات نے وحید عرشی کو مسلسل کھوئے کھوئے رہنے کی طرف مائل کیا۔ نتیجتاً ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے لیکن چمن میں گل کے مرجھانے سے اس کی خوشبو فنا نہیں ہوتی بلکہ یہ چمن کے دامن میں باقیات کے طور پر باقی رہ جاتی ہے اور جستجو کے سائے دور تک گئے تو حوصلوں کے جگنو ان کے شریک سفر ہو گئے جن کے اجالوں میں انہوں نے سانپ کے پھن کو کاٹنے کا جتن کیا لیکن اس نے آخر کار ان کو ڈس ہی لیا۔ لہٰذا ۱۳ فروری ۱۹۸۶ء کو اردو شاعری کے اُفق کا یہ تابناک ستارہ موت کے گھنگھور بادلوں میں ڈوب گیا لیکن اس نے اپنی شاعری سے جو تابانی بکھیری اس کی رمق کبھی فنا نہیں ہوگی کیوں کہ ـــــ

تو ہے اک پھول تجھے آنچ خزاں کی نہ لگے
میں تو خوشبو ہوں' ہواؤں میں بکھر جاؤں گا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بلیغ فکر کا شاعر —— وحید عرشی

ڈاکٹر افضال عاقل

شعبۂ اردو' بھیرب گنگولی کالج (بیل گھڑیا)

تخلیق کا عمل مشاہدہ' تجزیہ اور مطالعے کے وسیلے سے عمل پذیر ہوتا ہے کیوں کہ تخلیق بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں خالق کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ یعنی تخلیق ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے تخلیق کار مشاہدے اور تجربے کو سلیقے سے پیش کرتا ہے۔ یہی تخلیقی روش اگر لفظوں کا جامہ پہن لیتی ہے تو ادب عالیہ میں جگہ بنا لیتی ہے۔ تخلیق اور تخلیقیت پر بحث پھر کبھی ہوگی۔ فی الحال یہ کہنے دیجئے کہ بنگال کے جن تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات سے ادب اور ادب کے رشتے' سماجی زندگی کی اجتماعی خواہشات اور مشترکہ رجحانات کی نشاندہی کی ہے یا تخلیق کے محاسن کو مربوط بنایا ہے ان میں وحید عرشی بھی شامل ہیں۔ وحید عرشی نے اپنی شاعری کے وسیلے سے اصناف سخن کو ایک مربوط احساس سے مالا مال کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے قاری کو یہ تاثر دیا ہے کہ ''ادبی تخلیق'' زندگی کی پہچان ہوتی ہے اور قاری کے ذہن کو روشن بھی کرتی ہے۔

یہ دسمبر ۱۹۸۵ء کی بات ہے۔ سال ۱۹۸۵ء کو ''نوجوانوں کا سال'' سے معنون کیا گیا تھا اور اس موقع سے نظم خوانی کی ایک تقریب حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول میں منعقد ہوئی تھی۔ اس مقابلے کا میں بھی ایک امیدوار تھا اور ایک روم میں بیٹھے اقبالؔ کی نظم ''ساقی نامہ'' کی ریہرسل کر رہا تھا کہ وحید عرشی آکر سامنے کھڑے ہوگئے اور انہوں نے مسکرا کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ——

''اچھا پڑھ لیتے ہو' مگر کامیابی کے لئے بلند آواز کی ضرورت ہے''۔ اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔ نظم خوانی کا مقابلہ بہت دلچسپ رہا۔ مقابلے کے اختتام پر نتیجے کا اعلان کیا گیا۔ میری پوزیشن دوسری رہی۔ پروگرام کے بعد میں نے ان سے ملاقات کی۔ میری کامیابی پر انہوں نے کہا —— ''زندگی کا دوسرا نام جدوجہد ہے'' اور مبارکباد بھی دی۔ ان کی باتیں سننے کے بعد میں نے پوچھا —— ''سر'' آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ مسکراتے ہوئے

انہوں نے کہا ——

''میں دنیا میں رہتا ہوں۔ میرا نام وحید الحق ہے اور اردو کا خادم ہوں''۔ ۴ فروری ۱۹۸۶ء کی بات ہے۔ میرے دوست ارشاد احمد خاں (کانکی نارہ) میرے گھر آئے اور انہوں نے خبر دی کہ وحید عرشی (خواجہ وحید الحق) کا انتقال ہوگیا۔ یعنی ان سے میری پہلی ملاقات ہی آخری ثابت ہوئی۔

وحید عرشی کے تخلیقی سفر کے واضح نقوش ''یادوں کا زنداں'' سے ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے مطالعہ سے فکر واحساس کے کئی دریچے کھلتے ہیں اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں اپنی مٹی کی مہک اور آپ بیتی کی خوشبو موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں فکر وتخیل کی لالہ کاری و پرکاری کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔ ان کے شعری اذہان و افکار سنجیدہ اسلوب کی مثالیں ہیں۔ ان کی شاعری میں عصری حسیت کا احساس ہے۔

وحید عرشی کی شاعری ٹوٹے بکھرے جذبات سے مملو ایک ایسا نگار خانہ ہے جو زمانے کی کجروی پر طنز کرتا ہے اور اس طنز کے پہلو میں عروج وزوال کے دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں۔ نیز یہ بھی حقیقت اپنی جگہ صد فیصد درست ہے کہ ان کی غزلوں میں سچے انسان کا درد اور زندہ احساس سانس لے رہے ہیں۔ کمال جعفری کی رائے —— ''ان کی غزلوں میں میرؔ کا درد' داغؔ کی سادگی اور غالبؔ کا جدید اندازِ بیان ملتا ہے''۔ سے انحراف کرتے ہوئے عرض کرنے دیجئے کہ کمال جعفری کی رائے سے وحید عرشی کی شاعرانہ عظمت مجہول ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ ان کی شاعری زندگی کی جدوجہد کے تلخ احساسات اور انانیت' ذہن ودل پر دستک دے رہی ہیں —— ملاحظہ کیجئے۔ ''ماضی کا آئینہ'' ''یادوں کی کرنوں'' اور ''زخمی احساس'' کو شاعر نے بطور استعارہ پیش کیا ہے اور استعارے کے اشعار میں اس طرح چسپاں ہیں کہ پیوند کا احساس نہیں ہوتا۔

کیسے سناؤں غم کی کہانی سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے کہہ جاؤ حال کو ہے انکار بہت
ٹوٹا ماضی کا آئینہ بکھری یادوں کی کرنیں
زخمی ہیں احساس کے تلوے چلنے سے بیزار بہت
بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت

شاعری کا ماضی کا آئینہ ٹوٹا ہے تو یادوں کی کرنیں بکھر جاتی ہے اور احساس کے تلوے زخمی ہو جاتے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہیں۔ پھر بھی شاعر ''یادوں کے زنداں'' سے نکلنے کی سعی کر رہا ہے لیکن یادوں کے زنداں کی دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ ارادہ کرنے کے باوجود رہائی ممکن نہیں اور شاعر کی سانسوں پر غم کی کہانی کا بار بھی ہے اور ماضی کے کچھ ایسے حادثے ہیں کہ وہ پر فریب دور سے نکلنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ شاعر کے نزدیک ''حیات کا غم'' دست و پا کے لئے کیلیں بن گیا ہے اور وہ اپنے آپ کو صلیب پر لٹکا ہوا محسوس کر رہا ہے۔

غم حیات کی کیلیں تھیں دست و پا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے

اور جب غم حیات کی کیلیں دست و پا میں جڑ کر مستحکم ہو جاتی ہیں تو شاعر خود حیران ہو کر ارمان کی تابوت میں وقت کی کیلیں نصب کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات و کائنات سے ابھرنے والے نقوش ''یاد'' کی صورت میں ذہن و دل پر دستک لگاتے ہیں۔ الغرض وہ یادوں کے اشکوں میں بہہ جانے کا تہیہ کر لیتا ہے لیکن یہ ''یاد'' شاعر کے لئے ''شجر حیات'' ثابت ہوتی ہے اور اس کو تنہائی کے مفاہیم سے آشنا کراتی ہے۔

ارماں کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤ گے بہہ جاؤ گے اشکوں میں
ایک تنہائی تھی وہ بھی نہ ہوئی مجھ کو نصیب
کیوں تری یاد کی پرچھائیں ترے ساتھ چلی

شاعر وحید عرشی کی ''تنہائی'' ضرب المثال بن جاتی ہے۔ جب یہی ''تنہائی'' دل کا درد بن کر پلکوں پر اتر جاتی ہے تو یادوں کی سیل میں کتنے تاج محل ڈوب جاتے ہیں۔ دل ''گل صحرا'' کی مثال بن کر ''شب غم'' اور ''شب نیم جان'' کو ''درد دل'' کے شعلوں سے شوق کی بستی آباد کرنے کی گزارش کرتا ہے۔ ایسے حالات میں شاعر اپنے احباب سے مخاطب ہوتا ہے اور خواص و عوام کو متحیر کر دیتا ہے۔

دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے میری پلکوں میں
کتنے تاج محل ڈوبیں گے پانی کی ان بوندوں میں
ایک شبنم ہی جہاں رات گئے روتی ہے
دل ہوا میرا مثالِ گلِ صحرا اے دوست
لٹ گیا اب تو متاعِ غمِ تنہائی بھی
کس ادا سے تیری یادوں نے پکارا اے دوست
دل ہے سب کا اپنا اپنا درد ہے سب کا اپنا اپنا

اپنی کہانی کیوں لے بیٹھے عرشی ایسے لوگوں میں
شوق کی بستی بس جاتی ہے پل بھر میں
دل کا نگر ہے دھیرے دھیرے اجڑے گا

وحید عرشی کی غزلوں کے اشعار ایک مخصوص لے رکھتے ہیں۔ ان میں وارفتگی کی ایسی کیفیت ہے جو زخمی دل کے لئے مرہم کا کام کرتی ہے۔ شاعر نے غزل کے اشعار میں مے کشی، جام، سنگ، تیشہ، رہِ حیات، نشیمن، گلشن، مد و جزر، ساحل اور بیمار کی شام وغیرہ جیسے استعاروں کے استعمال سے غزل کو نغمگی اور ہم رہی سے قریب کر دیا ہے۔

مے کشی ہو گئی پختہ میری شاید کچھ اور
آج پھر ٹوٹ گیا جام، خدا خیر کرے
پھر بات وہ جو سنگ، تیشہ تک آ گئی
طوفان رہِ حیات میں برپا ابھی سے ہے
کیا حال نشیمن کا ہوا کچھ معلوم نہیں
اڑتی ہوئی گلشن سے شرر دیکھتے رہے
شاید ابھر آئے نہ کوئی ڈوبنے والا
ساحل پہ کھڑے مد و جزر دیکھتے رہے
عجیب شام ہے بیماری کی ہنسی کی طرح
کٹے گی آج کی شب بھی کئی صدی کی طرح
ہر ایک شخص ہے محتاط اس قدر عرشی
کہ اپنے آپ سے ملتا ہے اجنبی کی طرح

وحید عرشی کے یہاں رباعی کا تصور بھی ملتا ہے۔ ان کی رباعیوں میں زندگی کی مہک اور حسن کی کیفیات بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ کیجئے۔

کبھی زلفوں کو مہکایا تو ہوتا
دلِ مضطر کو بہلایا تو ہوتا
میں زہر غم بھی پی جاتا خوشی سے
محبت سے کبھی دیکھا تو ہوتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بے اختیار آج بھی آنسو نکل پڑے
کیسے تجھے بھلانے کی کوشش کوئی کرے
نالوں کو چرخ اشکوں کو خاک اور مجھے جنوں
اس دل کو تم نے چھوڑ دیا کس کے آسرے
کہیں نہ نیند کی وادی نہ یاد کے سائے
یہ راہ فکر کی کس زیست سے گزرتی ہے
اداس خواب بھٹکتے ہیں دور آنکھوں سے
تمام رات خیالوں کی دھول اڑتی ہے

روایتی الفاظ کو نئے اسالیب کے ذریعہ اپنے عہد کے کرب ومسرت کو نئے اجتماعی ادراک کے ساتھ پیش کرنے والے شاعر وحید عرشی کی نظمیں لفظیات اور اسلوب کی سطح پر نئی روایت کا عکس بن گئی ہیں۔ان کی نظموں کے ہر مصرعے کے ساتھ نظم مربوط تجربے سے مملو ہیں۔مصرعوں کا دروبست' لہجہ' زبان اور الفاظ کی ترتیب نمایاں جدید کلاسیکی رچاؤ رکھتے ہیں۔ان کی نظموں میں فطری زندگی کی آنچ بھی ہے اور تخلیقی جہت کا احساس بھی۔ان کی نظموں میں زندگی کی حرارت نئے نئے زاویے بناتی ہے۔عوام کے اذہان وافکار میں بکھرے ہوئے جذبات اور ان کے مضطرب ومتحرک رویے شاعر کو ایسی نظمین لکھنے پر مجبور کرتی ہے جو زمانے کی کجروی پر طنز کی بارش کرتی ہے۔وحید عرشی کی ایک ایک نظم بلیغ فکر رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں ان کی ذاتی زندگی کے تلخ احساسات' انانیت' ماضی کے ٹوٹے بکھرے تصورات' نیا آسمان تعمیر کرتے ہیں۔''یادوں کا زنداں'' میں شامل نظمیں کرب ذات وکائنات' جہد زندگی اور انانیت کے بے پناہ نقوش پیش کرتی ہیں۔پنڈت جواہر لعل نہرو کی وفات پر لکھی گئی نظم ''نوحہ'' قوم کے لئے شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی ہے۔نظم ''تجلی'' شکستہ حسرتوں کو امید کی کرن عطا کر رہی ہے۔نظم ''اقلیت'' اور ''فساد'' مذہبی ٹھیکہ داروں اور قومی یک جہتی کا جھوٹا پرچار کرنے والوں کی اصلیت آشکار کرتی ہیں۔

''بچھڑی ہوئی ماں کے نام'' ''آنسوؤں کے سیل'' ''درد وغم چناری'' وغیرہ زندگی کا مرثیہ ہیں۔ ''عورت'' ''درد'' ''دستک'' جدید نظم کی مثالیں ہیں۔جس میں ماضی اور حال کا کرب سانس لے رہا ہے۔ ''منظر پس منظر'' زبان' قوم اور مذہب کی عصبیت کا مرثیہ ہے۔''زندگی'' اور ''بے بسی'' لرزتے ذہن کی عکاسی کرتی ہیں۔بہرحال وحید عرشی سے متعلق عرض کرنے دیجئے کہ ''یادوں کا زنداں'' کے حوالے سے شاعر نے زندگی کے لمحات کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے نئی راہ کی نشاندہی کی ہے۔

یادوں کی بازیافت کا شاعر —— وحید عرشی

........................معید رشیدی

وحید عرشی بھی وکیل اختر' مظفر حیدری' ناظر الحسینی' فاروق شفق اور خلش امتیازی کی طرح مغربی بنگال کے جواں مرگ شاعروں میں ہیں۔محض ۴۳ سال کی عمر میں وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ وہ بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی (کلکتہ) میں بحیثیت لکچرر درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔۳ فروری ۱۹۸۶ء میں ان کی وفات ہوئی۔ان کا مجموعۂ کلام ''یادوں کا زنداں'' ان کی موت کے پانچ سال بعد ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آیا۔مجموعہ بالکل اسم بامسمیٰ ہے جسے ان کے قریبی دوست کمال جعفری نے مرتب کر کے دہلی سے شائع کیا۔مجموعے میں فقط ۱۵ غزلیں' ۲۴ نظمیں' ۱۲ قطعات اور ۷ متفرق اشعار شامل ہیں لیکن یہی ان کا اثاثہ نہ تھا۔ان کی وفات کے بعد جو چیزیں دستیاب ہو سکیں انہیں تو کمال جعفری نے یکجا کر کے شائع کیا۔ان کے مجموعے میں نظموں کی تعداد زیادہ ہے جب کہ غزلوں کی تعداد کم ہے۔مگر میرا خیال ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں۔ان کے کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کم کہتے ہیں مگر سوچ سمجھ کر اور چھان پھٹک کر کہتے ہیں اور اچھا کہتے ہیں۔ان کا معیارِ کلام بلند ہے۔'یاد' ان کی شاعری کا کلیدی لفظ ہے۔ان کے نزدیک یادِ ماضی عذاب نہیں ہے۔وہ اختر انصاری کی طرح یہ نہیں چاہتے کہ ان سے ان کا حافظہ چھین لیا جائے۔وہ اپنے ماضی کو عزیز رکھتے ہیں' اسے یاد کرتے ہیں اور اس میں ڈوب جاتے ہیں۔کبھی کبھی وہ یادوں کی دھند میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے وجود کا بھی احساس نہیں ہوتا۔وہ متحیر ہو کر خاموشی کے ساتھ یادوں کی بارات کا نظارہ کرتے ہیں:

دم بخود جسم تھا خاموش کھڑی تھی گم سم
ذہن کے شہر سے جب یاد کی بارات چلی

ان کی 'یادیں' نہ صرف فکری طور پر کثیر الجہات ہیں بلکہ ان کے اندر گہری معنویت بھی پوشیدہ ہے۔وہ تنہائی پسند ہیں مگر یادوں کی بارات میں بھی انہیں کشش نظر آتی ہے اور وہ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔یادوں کا ساتھ ملتے ہی ان کی تنہائی دور ہو جاتی ہے۔وہ گوشہ نشین ہیں مگر کبھی کبھی وہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گوشہ نشینی سے بیزار ہو کر یادوں کو اپنا رفیق و ہمدم بناتے ہیں اور ان کے سائے میں پناہ لیتے ہیں۔ انہیں متاعِ غمِ تنہائی کے لٹنے کا افسوس بھی ہے مگر وہ یادوں کی قدروں کے قائل بھی ہیں۔ اکثر یادیں انہیں اس قدر گھیر لیتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اسیرِ زنداں تصور کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ اس اسیری سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی کوششِ بسیار بیکار جاتی ہے۔ یادیں ان کے لئے ساحل کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ موجوں کی طرح ان سے ٹکرایا کرتے ہیں۔ لہروں کی طرح ساحل کو چوما کرتے ہیں۔ شبِ غم میں یادیں ان کے واسطے چراغ کا کام کرتی ہیں۔ جب ان کی یادوں کے دیئے فروزاں ہوتے ہیں تو تیرگی چھٹ جاتی ہے اور ایک نئی صبح کا پیغام لاتی ہے۔ جس میں ہنگامہ نہیں بلکہ ایک سکوت ہوتا ہے۔ جب ان کے ماضی کا آئینہ ٹوٹتا ہے تو وہ خواب سے بیدار ہوتے ہیں لیکن یادوں کا سلسلہ اب بھی ختم نہیں ہوتا۔ حالانکہ ان کا ذہن تھک چکا ہوتا ہے مگر پھر بھی یادوں کا ایک طویل قافلہ رواں دواں نظر آتا ہے۔ ہر طرف یادیں ہی یادیں —— یادوں کی بارات یادوں —— کا لامتناہی ہجوم —— یادوں کا جنگل —— یادوں کا صحرا —— یادوں کا سمندر —— جن میں صد ہا راز پوشیدہ ہیں۔ خواہشات کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ سینکڑوں کہانیاں مستور ہیں۔ بے شمار زخم تازہ ہیں۔ ان میں غموں کا بسیرا ابھی ہے۔ مایوسیوں کا گزر بھی اور ان کو جھیل جانے کا جنون بھی:

ارماں کے تابوت میں جب مَیں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤ گے بہہ جاؤ گے اشکوں میں
بحرِ غمِ دوراں میں اک اک چیز تمہاری پھینک دی مَیں نے
یاد مگر بن بیٹھی ساحل ڈوب سکی نہ موجوں میں
ایک تنہائی تھی وہ بھی نہ ہوئی مجھ کو نصیب
کیوں تری یاد کی پرچھائیں مرے ساتھ چلی
بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت
ٹوٹا ماضی کا آئینہ یادوں کی بکھری کرچیں
ذہن کے زخمی تلوے اب ہیں چلنے سے بیزار بہت
آپ پشیماں آخر کیوں ہیں مجھ کو کچھ بھی یاد نہیں
کس کی محبت، کیسی کہانی، کس سے کیا تھا پیار محبت

مرجھا نہ سکا یاد کی شاخوں کا کوئی پھول
اتنا تو کیا ہے مری آنکھوں کی نمی نے
شب کی تنہائی ہو اور یاد کسی کی پیہم
درحقیقت وہی لمحات حسیں ہوتے ہیں
یوں شبِ غم میں تری یاد دبے پا آئی
تیرگی سے ہو نمو جیسے سویرا اے دوست
لٹ گیا اب تو متاعِ غمِ تنہائی بھی
کس ادا سے تری یادوں نے پکارا اے دوست

وحیدؔ عرشی کی شاعری میں میرؔ کی روایت کا اثبات اور اس کی توسیع ملتی ہے۔ فانیؔ کی قنوطیت ملتی ہے۔ ان کا رنگ میرؔ کے رنگ سے لگا کھاتا ہے۔ میرؔ کی مانند ان کے سینے میں بھی جہانِ غم موجود ہے۔ جس کا شعری اظہار ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ غم ان کا مقدر ہے۔ اُداسی سے انہیں نجات نہیں۔ وہ اپنی کہانی سنانا چاہتے ہیں مگر ماضی و حال کے تذبذب میں مبتلا ہیں۔ ان کی سانسوں کا بارِ گراں انہیں بار ہا ذہنی کچوکے لگاتا ہے۔ وہ شب کے سمندر میں مسلسل پتوار چلاتے ہیں مگر انہیں کنارا نہیں ملتا۔ صبح کی سحر خیزی انہیں نصیب نہیں ہوتی۔ وہ مصائبِ زمانہ سے دوچار ہیں۔ وہ دھوپ کی شدت میں چلتے ہیں لیکن چھاؤں کے ملنے کی اُمید پر نہیں رہتے۔ ان کا غم پاک اور بے لوث ہے۔ انہیں دوسروں کی نمائشی ہمدردی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ بھری دنیا میں انہیں کوئی اپنا نہیں ملتا جسے وہ اپنی غم ناک کہانی سنا سکیں۔ کہتے ہیں:

سب کا دل ہے اپنا اپنا، درد ہے سب کا اپنا اپنا
اپنی کہانی کیوں لے بیٹھے عرشیؔ ایسے لوگوں میں
کب تک خواب بنے گا اے دل اُمیدوں کی چھاؤں گئی
دیکھ تو کیسا دن چڑھ آیا، دھوپ ہی دھوپ ہے راہوں میں
کیسے سناؤں غم کی کہانی سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے کہہ جاؤ، حال کو ہے انکار بہت
پَو پھوٹے، پر کشتیِ دل تھی ورطۂ ظلمت ہی میں ابھی
یوں تو چلائے شب کے سمندر میں ہم نے پتوار بہت

زندگی معمہ ہی سہی اس کے نقوش قدم قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔ موت حقیقت ہے جب کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زندگی افسانہ۔اس افسانے میں قدرت کی فنکاری کبھی کبھی اپنا شاہکار دکھلاتی ہے جسے دیکھ کر روح تڑپ اٹھتی ہے۔جھوم اٹھتی ہے۔کبھی بے ساختہ اور کبھی طنزیہ قہقہہ لگاتی ہے اور کبھی اُداس ہو جاتی ہے۔زندگی غم سے عبارت ہے یا خوشی سے‘ یہ الگ مسئلہ ہے لیکن اس میں پختگی اُسی وقت آتی ہے جب وہ غموں کی دھیمی آنچ میں سلگتی ہے۔غمِ حیات رنج وآلام کے شعلوں میں تپ کر جوان ہوتا ہے۔غم کی شدت اور اس کا اثبات اپنے دامن میں بے شمار جہات رکھتا ہے۔غم ازل ہی سے انسان کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا ہے۔ایک عام شخص رو دھو کر اپنا غم ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ایک فلسفی اس کی دھند میں کھو جاتا ہے اور اس کا سراغ پانے کی کوشش میں اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ایک مصور غم اس کی بنائی ہوئی تصاویر میں نظر آتا ہے۔ایک ادیب کا مشاہدہ جب غم کی لہر پر اسرار وادیوں میں بھٹکتا ہے تو وہ خون کو روشنائی بناتا ہے اور پھر خود بخود کتابِ زیست کے اوراق غم زدہ ہواؤں کے زور سے کھلتے جاتے ہیں۔وہ صفحۂ قرطاس پر اپنی کہانی اس طرح رقم کرتا ہے اس کی کہانی رودادِ جہاں معلوم ہونے لگتی ہے اور اس میں سامع یا قاری ڈوبتا چلا جاتا ہے۔وحیدؔ عرشی کی زندگی میں بھی غموں کا حصہ زیادہ ہے۔ان کا غم ایک فرد کا غم نہیں بلکہ ایک انجمن کا غم ہے۔ان کا غم آفاقی نوعیت کا حامل ہے۔ان کا مشاہدہ بھی عمیق ہے۔ان کی کہانی بھی رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے اور قاری وسامع کو داستان۔وحیدؔ عرشی عام انسان کی حیثیت سے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔وہ فلسفی بھی تھے‘ مفکر بھی تھے‘ مصور بھی تھے‘ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی مگر ان کے دست و پا میں غمِ حیات کی کیلیں جڑی رہیں اور وہ تمام عمر صلیب پر لٹکے رہے:

غمِ حیات کی کیلیں تھیں دست و پا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے

مایوسیوں نے وحیدؔ عرشی کے ہاں زبان پائی ہے۔وہ پہلے درد و غم اور حزن و یاس کا ادراک کرتے ہیں‘ پھر اسے شعری جامہ پہناتے ہیں۔میر کی طرح ان کا دل شام ہی سے بجھ جاتا ہے اور مہیب رات کی گرانی ان پر نہایت شاق گزرتی ہے جس کا تصور انہیں مضطرب کر دیتا ہے:

عجیب شام ہے بیمار کی ہنسی کی طرح
کٹے گی آج کی شب بھی کئی صدی کی طرح
ہر ایک شخص ہے محتاط اس قدر عرشیؔ
کہ اپنے آپ سے ملتا ہے اجنبی کی طرح
دل دھڑکتا ہے سرِ شام خدا خیر کرے

کیا ہو اس رات کا انجام خدا خیر کرے
قبر تک کاندھا بدلتے ہی چلے
دوستوں پر موت بھی بھاری ہوئی

یہ اس شاعر کے اشعار ہیں جو اُردو کا خاموش مجاہد تھا۔جس نے اُردو کے فروغ کے لئے قربانیاں دیں۔اس نے نہایت بے چارگی کے عالم میں وقت سے پہلے ہی موت کو اپنے سینے سے لگایا کیوں کہ بقولِ منوّر رانا ——— ’’مزدوروں کی بستی میں اسپتال کہاں‘ اسپتال ہے تو دوائیں کہاں‘ دوائیں ہیں تو ڈاکٹر کہاں‘ ایمبولنس ہے تو ڈرائیور کہاں‘ ایک خوددار شاعر کی سانسیں آکسیجن کی محتاج ہو گئیں لیکن اس شخص نے محتاج بن کر جینا سیکھا ہی نہیں تھا۔وہ تو پلاسٹک کے بے مصرف ٹکڑوں سے بٹن بنا لیتا تھا‘ پاؤں میں چبھنے والے کانٹے سے خلال کا کام لیتا تھا‘ لکڑی کے فضول ٹکڑوں سے غالبؔ کی تصویر بنا ڈالتا تھا‘ روندی ہوئی ملائم مٹی سے میرؔ واقبال کے مجسمے ڈھال لیتا تھا‘ تلخیوں اور حادثوں کو تراش کو غزل بناتا تھا۔شیشوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے دل بناتا تھا‘‘۔(یادوں کا زنداں ——— ص:۱۵-۱۶)

اُداسی خواہ وَلی دکنی ہو یا میر تقی میرؔ کی‘ فانیؔ بدایونی اور ناصر کاظمی کی ہو یا پھر وحیدؔ عرشی کی‘ اُردو شاعری کی روایت کا اٹوٹ حصہ رہی ہے۔جذبات واحساسات کی شدت وحیدؔ عرشی کی شاعری کو گراں مایہ بناتی ہے۔ان کے بیان میں ندرت بھی ہے اور فنی پختگی بھی۔ان کے ہاں اظہار کا فلسفہ بھی ہے اور نیا پن بھی۔وہ ذہنی قلابازیاں دکھا کر حیران نہیں کرتے۔ان کی شاعری مداری کا کھیل اور کرتب نہیں۔ان کے دل پر جو گزرتی ہے اسے شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کس کے جنونِ شوق کا چرچا ابھی سے ہے
سمٹی ہوئی جو وسعتِ صحرا ابھی سے ہے
ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے
دور تک جستجو کے سائے گئے
نظروں کے تصادم پہ اک پل کو ہنسا تھا
اک عمر رلایا مجھے اک پل کی ہنسی نے
کیا جانیے کیوں تکتے رہے راہ کسی کی
آنے کا تو وعدہ بھی کیا تھا نہ کسی نے
ایک شبنم ہی جہاں رات گئے روتی ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دل ہوا میرا مثالِ گلِ صحرا اے دوست
صدیوں زیرِ آب رہا لیکن چنگاری بجھ نہ سکی
بحرِ ہستی میں گویا میں پتھر تھا انسان نہ تھا
مے کشی ہوگئی پختہ مری شاید کچھ اور
آج پھر ٹوٹ گیا جام خدا خیر کرے
شوق کی بستی بس جاتی ہے پل بھر میں
دل کا نگر ہے دھیرے دھیرے اجڑے گا

وحیدؔ عرشی کی غزلوں کا رومانی پہلو بھی جاذب اور توجہ طلب ہے۔ان کے ہاں عشق کوئی روگ اور کوئی بلا نہیں۔ان کا عشق بھی ان کے غم کی طرح پاک ہے۔ان کے ہاں ہوس کا گزر نہیں۔تصور کی آنکھوں سے وہ اپنے محبوب کے دیدار کے خواہاں ہیں۔نہ وہ مجنوں کی طرح صحرا کی خاک چھانتے ہیں اور نہ ہی گریباں چاک کرتے ہیں۔چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

بہرِ تسکینِ خاطرِ ناشاد
تم تصور ہی میں چلے آؤ
آتی ہے قضا کس کی
آئینہ مقابل ہے

تمہارے روئے منور کی ضو میں ڈوب گیا
فلک پہ چاند جو نکلا تھا ہمسری کے لئے
عقل اور دل میں ترے حسن پہ اک بات چلی
کل بہت رات بہت رات گئے رات ڈھلی
چھا گیا میرے مقدر پہ اندھیرا اے دوست
تو نے شانوں پہ جو گیسو کو بکھیرا اے دوست
تیرے گیسو مری الجھن کے خطاوار نہیں
تو نے ان کو تو کئی بار سنوارا اے دوست

مظہرؔ امام کہتے ہیں:
''وحیدؔ عرشی نے ۴۳ سال کی عمر میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے موند لیں۔یہ عمر دنیا سے رخصت

ہونے کی نہیں ہوتی لیکن زندگی جھیلنے کی اذیت بذاتِ خود جاں گسل ہے۔شاعر خواہ خود لہولہان ہو لیکن اگر اس کی شاعری دوسروں کے زخموں کا مرہم نہیں بنتی تو بے توقیر ہو جاتی ہے۔وحیدؔ عرشی کی شاعری میں فرد کا ہی نہیں' انجمن کا غم بھی شامل ہے۔ان کے فن کے لمس سے دلوں میں تازگی اور توانائی کے چراغ جل اٹھتے ہیں''۔(یادوں کا زنداں —— فلیپ کی رائے)

جس طرح وحیدؔ عرشی کی شخصیت میں سحر تھا' اسی طرح ان کی شاعری میں بھی سحر ہے۔ان کے شعروں میں کھو جانے والی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ان کے اشعار ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ان کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی۔ان کی شاعری سدا اپنی جانب متوجہ کرتی رہے گی۔

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قطعہ بر وفات وحید عرشی

ابراہیم ناشاد (کھلنا) بنگلہ دیش

غم دیدہ ونم دیدہ ہے موضوع ہر گفت وشنید
عیش وطرب کا ذکر نہیں ہونٹوں کے نزدیک وبعید
جس محفل میں جاتا ہوں ناشاد یہی سنتا ہوں صدا
آہ وحیدؔ آہ وحیدؔ آہ وحیدؔ آہ وحید

وحید عرشی

دلؔ عرفانی

تاریخ وفات: ۳ فروری ۱۹۸۶ء

غم و اندوہ کا عالم نہیں لکھا جاتا
دوستِ دیرینہ کا ماتم نہیں لکھا جاتا
اشک خونیں کا یہ سیل رواں آنکھوں سے
مجھ سے یہ "قطرۂ شبنم" نہیں لکھا جاتا
اس کے اخلاص نے وہ دل پہ لگائے نشتر
اب کوئی درد کا مرہم نہیں لکھا جاتا
اس کا انداز تکلم نہیں بھولا جاتا
راز خاموشیِ ہمدم نہیں لکھا جاتا
گنگنا اٹھتی تھی جن ہونٹوں پر نغموں کی بہار
اس سے اچھا کوئی سرگم نہیں لکھا جاتا
رات بھر دھوپ کا موسم رہا سرگرم خیال
اب کسی طرح کا موسم نہیں لکھا جاتا
کون سلجھائے تری زلف کو اے "جان غزل"
کتنے پیچیدہ ہوئے خم نہیں لکھا جاتا
ایک اس کے نہیں ہونے سے مرے ہم بزمو!
کس قدر ٹوٹ گئے ہم نہیں لکھا جاتا
وہ کہ اک شخص تھا معروف تصور بکمال
اس کو بیگانۂ عالم نہیں لکھا جاتا
سانحہ دل پہ وہ ٹوٹا ہے کہ دلؔ ہی جانے
مجھ سے یہ حادثہ غم نہیں لکھا جاتا

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قطعات

(وحیدؔ عرشی کی چھٹویں برسی پر)

زماں قاسمی..................................

محفل ہے سوگوار کہ عرشی نہیں رہے
آنکھیں ہیں اشکبار کہ عرشی نہیں رہے
روتے ہیں بار بار کہ عرشی نہیں رہے
غمگیں ہیں غمگسار کہ عرشی نہیں رہے

چل دیا بے گماں وحید عرشی
تجھ کو ڈھونڈیں کہاں وحید عرشی
تجھ سے قائم تھی بزم کی رونق
شاعر خوش بیاں وحید عرشی

آئی کیسی ہوا پھر تری یاد کی
زخم رسنے لگا بڑھ گئی بے کلی
آج عرشی نہیں بات جمتی نہیں
ایسے میں اب بھلا کیا لکھے قاسمی

۲۰-۰۲-۹۲
آبشار

اداکار ـــــ نور اقبال

پروفیسر وحیدؔ عرشی کی دوسری برسی کے موقع پر پڑھی گئی نظم

پھر وحیدؔ عرشی کی تعزیت کے لئے
غمگساروں نے مجمع لگایا یہاں
باتیں ہونے لگیں ان کے اوصاف کی
وقت نے غافلوں کو جگایا یہاں

ساتھیو! آج پھر مجمع عام میں
اپنافن سارے فنکار دکھلائیں گے
جگمگاتے ہوئے اونچے اسٹیج پر
گیت مرحوم کے جھوم کر گائیں گے

آج پھر شبدوں کے جھن جھنے سن کے ہم
اپنے گھر روتے گاتے چلے جائیں گے
سالِ آئندہ پھر ہم اسی طور سے
دل گرفتہٗ شکستہ یہاں آئیں گے

سوگ عرشی کا پھر ہم منانے کے بعد
بے حسی کی گپھاؤں میں سوجائیں گے
پھر کہاں ہم نظر آئیں گے دوستو!
اپنی اپنی فضاؤں میں کھوجائیں گے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آج عرشی کو ہم رو رہے ہیں مگر
دوسروں کے لئے کوئی روتا نہیں
صاف گوئی معاف اپنے ماحول میں
ہم کو کرنا ہے جو کام، ہوتا نہیں

کب تک آخر یوں کھچڑی پکے گی یہاں
بند کمرے سے میداں میں آؤ ذرا
صرف تقریر سے بات بنتی نہیں
اپنا جوشِ عمل اب دکھاؤ ذرا

عرشی تھے درس و تدریس سے منسلک
روز و شب ان کے اخلاص کا دم بھریں
اور موصوف کے نام پہ شہر میں
آؤ ہم کوئی اسکول قائم کریں

شاعرِ نامراد عرشی تھے دوستو!
کیوں نہ پورا کریں ان کے ارمان ہم
بزم قائم کریں نامِ مرحوم پر
اور شائع کریں مل کے دیوان ہم

ورنہ ہم کو سرِ بزم کہنے دو یہ
فطرتاً ہم سبھی مردِ گفتار ہیں
دعویٰ دوستی صرف اک ڈھونگ ہے
ہم اداکار ہیں ہم اداکار ہیں!

صلیب زیست کا شاعر

مظہر امام

وحید عرشی اس جوان مرگ شاعر کا نام ہے جو تمام عمر صلیب پر لٹکا رہا۔ کیوں کہ غم حیات کی کیلیں اس کے دست و پا میں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ یادوں کے زنداں سے نکل بھاگنے کے ارادے کرتا رہا' لیکن اس کے گرد ایک اونچی دیوار ایستادہ تھی اور وہاں سے باہر آنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ سوال الگ ہے کہ یہ دیوار معاشرے نے بلند کی تھی۔ یا خود اس نے۔ یا اس کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اپنے اپنے غموں میں الجھے ہوئے ہیں' وہ اپنی داستانِ درد انہیں سناتا رہا کیوں کہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ان سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے' جو گراں گوش ہیں۔

وحید عرشی نے ۴۳ سال کی عمر میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے موند لیں۔ یہ عمر دنیا سے رخصت ہونے کی نہیں ہوتی لیکن زندگی جھیلنے کی اذیت بذات خود جانکسل ہے۔ شاعر خواہ خود لہولہان ہو لیکن اگر اس کی شاعری دوسروں کے زخموں کا مرہم نہیں بنتی تو بے توقیر ہو جاتی ہے۔ وحید عرشی کی شاعری میں فرد کا ہی نہیں' انجمن کا غم بھی شامل ہے۔ ان کے فن کے لمس سے دلوں میں تازگی اور توانائی کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک خوش فکر شاعر ـــــ وحید عرشی

معین اعجاز

میں نے کئی جگہ یہ بات لکھی ہے کہ اپنی عمر کا جو حصہ میں نے کلکتہ میں گزارا ہے وہ مجھے بیحد عزیز رہا ہے اور کلکتہ کے ادبی حلقوں میں جن دوستوں سے میری قربت رہی ان میں مرحوم وحید عرشی بھی شامل تھے جو نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ بہت ستھرے ہوئے ذوق کے مالک بھی تھے۔ اس وقت ان کا ایک شعر بے ساختہ ذہن میں آ رہا ہے جو اکثر ان سے سنا تھا۔

ارماں کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤگے بہہ جاؤگے اشکوں میں

رائیڈ اسٹریٹ میں شمس الزماں صاحب کی رہائش گاہ پر اکثر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ کافی دیر تک ادبی اور سیاسی مضوعات پر گفتگو کا سلسلہ چلتا۔ وہ کلکتہ سے دور ایک مضافاتی علاقے کانکی نارہ میں رہتے تھے لیکن شہر کے ایک کالج میں لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اس لئے وہاں سے فارغ ہو کر کچھ وقت یہیں گزارتے اور پھر واپس جاتے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالرؤف صاحب کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی تھی اور خوش قسمتی سے اس شادی میں شریک بھی تھا۔ افسوس کہ دلی آنے کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور اس وقت دل پر اور چوٹ لگی جب یہ سنا کہ کسی بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اتنا اچھا شاعر اتنی کم عمری میں ہم سے رخصت ہو گیا اس سے بڑی بدقسمتی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔

ان کے یہ چند شعر دیکھئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بلاشبہ ایک خوش فکر شاعر تھے۔

ایک تنہائی تھی وہ بھی نہ ہوئی مجھ کو نصیب
کیوں تری یاد کی پرچھائیں میرے ساتھ چلے

☆☆

تیرے گیسو میری الجھن کے خطاوار نہیں
تو نے ان کو تو کئی بار سنوارا اے دوست

☆☆

دل ہے سب کا اپنا اپنا درد ہے سب کا اپنا اپنا
اپنی کہانی کیوں لے بیٹھے عرشی ایسے لوگوں میں

وحید عرشی

مشتاق احمد

خواجہ وحید الحق نام، قلمی نام وحید عرشی، عرشی تخلص، والد کا نام مولوی محمد حنیف۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۳ء کو نارائن پور (کانکی نارہ) ضلع ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں حمایت الغرباء ہائی اسکول (کانکی نارہ) سے اسکول فائنل پاس کیا۔ ۱۹۶۲ء میں ایم ایم سی کالج (کلکتہ) سے آئی اے اور اسی کالج سے ۱۹۶۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ ہوئے اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ۱۹۶۶ء سے حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر ہیں۔ آپ نے ۱۹۶۷ء میں باقاعدہ شاعری کی۔ کسی سے اصلاح نہیں لی۔

پتہ: نیا بازار، کانکی نارہ، ضلع ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

نمونۂ کلام:

بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت
غمِ حیات کی کیلیں تھیں دست و پا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے
دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے میری پلکوں میں
کتنے تاج محل ڈوبیں گے پانی کی ان بوندوں میں
ارماں کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤگے بہہ جاؤگے اشکوں میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آہ! وحید عرشی

ڈاکٹر معصوم شرقی

خواجہ وحید الحق (وحید عرشی) جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ۳ فروری ۱۹۸۶ء کو اپنے بے شمار مداحوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔ موت کے وقت ان کی عمر تقریباً ۴۳ برس تھی۔ ان کے پسماندگان میں بیوی اور تین بچوں کے علاوہ سینکڑوں غمگسار ہیں۔

وحید صاحب اس اسکول کے ایک قابل ٹیچر تھے تقریباً ۱۸ برسوں تک وہ اسکول سے وابستہ رہے۔ موت سے چند سال پیشتر لکچرار کی حیثیت سے وہ کلکتہ میں ایک کالج سے وابستہ تھے پھر بھی انہیں حمایت الغرباء ہائی اسکول سے والہانہ لگاؤ تھا اور بسا اوقات وہ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں نوازا کرتے تھے۔

اسکول میں وہ خواجہ وحید الحق کے نام سے جانے جاتے تھے لیکن ادبی حلقوں میں وحید عرشی کے نام سے مشہور تھے۔ ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ وہ ایک اچھے اور خوش فکر شاعر بھی تھے۔ قدرت نے انہیں گوناگوں خوبیوں سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوستوں اور مداحوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔

موت سے کچھ روز قبل وہ بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے۔ جیسے ان کی کوئی عزیز شے گم ہوگئی ہو' پھر بھی انہوں نے اپنے خیالات و جذبات کا کسی سے اظہار نہیں کیا اور اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح سلگتے رہے۔ انجام کار وہ Pleurisy (پھیپھڑے میں پانی آجانا) کے شکار ہوگئے۔ دوا اور دعا بیکار ثابت ہوئیں اور اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**

اساتذہ کرام' مجلس انتظامیہ کے ممبران' طلبہ اور حلقہ احباب خواجہ وحید الحق کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

مرنے پر بھی لو دیتی تھی دیوانے کے دل کی آنکھ
پتھرائی تھیں آنکھیں لیکن پھول سا چہرہ زرد نہ تھا

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے

....قیوم بدر

کانکی نارہ کے خوش فکر و جواں سال شاعر وحید عرشی کی بے وقت موت یقیناً ایک دلدوز سانحہ ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ چراغ گل ہوگیا جس کی روشنی سے کانکی نارہ اور جگتدل کی ادبی محفلوں کے چہرے منور تھے۔ مرحوم سے ہمارے تعلقات دیرینہ تو نہیں۔ مگر دس برس سے ضرور رہے ہیں اور ہمیں ان لمحوں پر فخر ہے جن لمحوں میں ہمیں وحید عرشی صاحب کے ساتھ بیٹھنے اور باتیں کرنے کے مواقع ملے ہیں۔ ان کا خلوص ان کی باتیں یقیناً ہمارے لئے ایک اثاثہ ہیں۔

ویسے تو وحید صاحب سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن ادھر ہم لوگ ''صدف'' کے سلسلے میں کئی بار ملے تھے اور انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ ''صدف'' کے لئے ایک غزل (جس کا ابھی صرف مطلع ہوا ہے) دو ایک دنوں میں بھجوا دیں گے —— لیکن شاید ان کی صحت نے موقع نہ دیا یا ہماری بدنصیبی تھی کہ ہم غزل سے محروم رہ گئے۔ وحید صاحب نے وہ مطلع اپنے مخصوص انداز میں سنایا تھا جو یوں ہے۔

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے
دور تک جستجو کے سائے گئے

انہوں نے یہ شعر کچھ اس ڈھنگ سے سنایا تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر چڑھ گیا اور ہم کئی دنوں تک اس شعر کو گنگناتے رہے۔ شعر کے آخری مصرعے کا لفظ ''دور تک'' کچھ اسی طرح کھینچ کر پڑھا تھا کہ یہ لفظ ہنوز ہمارے ذہن و دل کے محرابوں سے ٹکراتا ہوا محسوس ہوتا ہے —— وحید عرشی صاحب بنگال کی نئی نسل کے ممتاز شاعر تھے ان کے کہنے کا انداز نرالا تھا اور بیک وقت تحت اور ترنم دونوں میں پڑھتے تھے۔ مرحوم وہ واحد شاعر تھے جو آل انڈیا مشاعروں میں مضافات کی نمائندگی کرتے تھے۔ آج موت نے وحید صاحب کو ہم سے چھین لیا یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ وحید صاحب خود اپنے شعر کی تفسیر بن گئے۔ آج محفلیں ان کے بغیر سونی سونی سی لگیں گی ——

ان کی اچانک موت پر ہم دعا گو ہیں کہ باری تعالیٰ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ نیز ان کے متعلقین کے غم میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں۔

اداریہ: صدف ۱۹۸۷ء (سالانہ مجلہ' سیون اسٹار کلب' جگتدل)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

”آکاش پتر“

وحید عرشیؔ

آکاش پتر ”سن آف دی سوائل“ کی ضد ہے۔ صوبائی عصبیت کے شکار لوگ یہ فقرہ حقارت سے ان لوگوں کے لئے استعمال کرتے ہیں جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ بنگال کی ترقی میں ان کا آکاش پتروؤں نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے ——— اس مضمون کے لکھنے کا مقصد کانکی نارہ کی تاریخ لکھنا نہیں بلکہ ان حالات کا ایک سرسری جائزہ ہے جن کے تحت یہ علاقہ آباد ہوا۔

کانکی نارہ کے حالات درج ذیل برگذیدہ ہستیوں کے بیانات کی روشنی میں ترتیب دیے گئے ہیں۔

(۱) محمد صدیق صاحب ساکن نیا بازار (کانکی نارہ)، عمر تقریباً ۱۲۰ سال

(۲) حاجی محمد اسحاق سردار صاحب ساکن نیا بازار (کانکی نارہ)، عمر تقریباً ۱۰۸ سال

(۳) مقیمہ بی بی، زوجہ مرحوم عبدالصمد صاحب ساکن نیا بازار (کانکی نارہ) عمر تقریباً ۹۰ سال

ان کے علاوہ بہت سے دوسرے۔ میں جناب ایم جی مصطفیٰ اور جناب انور سبحانی کا ممنون ہوں جنہوں نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد فراہم کیا۔

بنگال کی سرزمین واقعی جادو کی سرزمین ہے۔ یہاں کے بھرپور ۶ موسم، جوانی کی سرمستیوں سے لبالب پوکھر، الہڑ دوشیزہ کی زلفوں کی طرح پر پیچ نالے، سبک رو ندیاں۔ زمین کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیت جن کی سبز بالیوں میں دھرتی ماں اپنا سارا دودھ بھر دیتی ہے۔ دودھ کے بوجھ سے تنی ہوئی بالیوں کا ہوا کی سہیلی بنکریوں ہولے ہولے جھومنا جیسے کوئی ماں مقدس بوجھ اٹھائے محو خرام ہو۔ ہاتھوں کو اچکنے پر اکساتے ہوئے پھلوں اور پھولوں سے لد پھد چھتنار پیڑ۔ نگہبان کی طرح ہر چہار سمت نظر رکھے ہوئے سربلند ہشیار تاڑ اور ناریل کے درخت، بوڑھے سنگریزوں کو چھیڑ کر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے شریر بچوں کی طرح بھاگتے ہوئے چشمے۔ تالابوں کی سطح پر پروسے ہوئے کنول، ہزاروں کہانیوں کے بوجھ سے بند آنکھوں کی طرح کلیاں۔ کھلے ہوئے کنول کے پھولوں کے درمیان کترا کترا کر گزرتی ہوئی رنگ برنگی سبک رو بطخوں کی قطاریں، پکے ہوئے سنہرے

کھیتوں کے پگڈنڈیوں پر گائے اور بکریوں کے بچوں کے پیچھے دوڑتی ہوئی بے نیاز کنواریوں کے جوڑوں کا کھل کھل کر لہرا اٹھنا۔ کسی برہ کی ماری کی آنکھوں کی طرح ڈبڈبائی ہوئی جھیلیں اور ان جھیلوں اور ندیوں میں جاگتی آنکھوں کے سپنوں کی طرح تیرتی ہوئی سبک روشنیاں دور تک پھیلی ہوئی پہاڑیاں ان پر ستائے ہوئے بادلوں کے آوارہ ٹکڑے۔ تالابوں اور ندیوں کے کنارے دست عطا کی مانند اوندھے ہوئے پھوس اور پوال کے مکان۔ رات کی تاریکی میں رستی ہوئی بانسری اور اکتارا کی مدھر تانیں۔ پلی گیتی اور بادل گیتی میں سموئی ہوئی بنگال کی روایات۔ اساطیری داستانیں رسومات کے تذکروں کا مخصوص دھنوں میں رات گئے تک شبنم کے ان معصوم قطروں کی طرح برستے رہنا جو کانٹوں کا منہ بھی موتیوں سے بھر دیتے ہیں۔ گاؤں کے کنارے عصا ٹیکے ہوئے کسی برگذیدہ بزرگ کی طرح برگد کے پیڑ بالکل ایسے لگتے ہیں جیسے کسی اونچی جگہ رکھی ہوئی مذہبی کتاب جس کے پتوں پر بنگال کی تمام تر مقدس کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ برسات میں دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی، موسلا دھار بارش میں جھومتے ہوئے بانس کے جنگل۔ اپنی ہتھیلیوں پر چاندی کے قطرے لئے ہوئے کچو پتے گویا کہہ رہے ہوں ”دیکھو کس طرح پانی چاندی بن جاتا ہے ——— ہے نا جادو“۔ یہ سارا منظر کچھ ایسا دلفریب ہوتا ہے کہ دیکھنے کے لئے جل ڈھابوں میں پانوں کی زبردست بھیڑ لگ جاتی ہے۔ بنگال کے قدرتی مناظر شروع سے ہی یہاں سے گزرنے والے اجنبیوں کو دعوتِ نظر دیتے رہے ہیں اور پھر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جو بھی ایک بار یہاں آیا بنگال کی سرزمین نے اسے نہیں چھوڑا۔ اس کے جادو نے انہیں اپنا وطن، اپنے کھیت، اپنے لوگ سب سے جدا کر کے رکھ دیا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ بنگال کے حسن نے صرف ہندوستان کے دیگر صوبوں کے لوگوں کو ہی متوجہ نہیں کیا بلکہ دور دراز کے سرد ملکوں کے سردیوں میں نقل وطن کرنے والے پرندوں کے پروں کو بھی جوڑ کر گرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک قیاس کے مطابق سردیوں میں لاکھوں کی تعداد میں سائبریا اور دوسرے ممالک کے پرندے بنگال کے سندر بن کے علاقے میں آکر پھیل جاتے ہیں۔

جس طرح صدیوں قبل سے یہ پرندے بنگال میں آتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے دیگر صوبوں کے لوگ بھی آتے رہے ہیں۔ کبھی حملہ آور راجاؤں بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ کبھی بیوپار کی غرض سے کبھی مزدور بن کر۔ اور یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا اور ان آنے والوں کی بہتیری اکثریت اس طرح یہیں کر ہو کر رہ گئی کہ اپنی زبان، اپنی روایات، اپنی مخصوص خوراک اپنا پہناوا سب کچھ تج دیا اور پورے طور پر بنگال کے ہو کر رہ گئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

واقعی بنگال کی سرزمین بڑی پرکشش ہے ——— الف لیلیٰ ہزارداستاں کے مصنفوں کے ذہن میں بنگال کا حسن اور جادو چٹکیاں لے رہا تھا۔ تقریباً نویں صدی ہجری میں تلنگانہ میں بیٹھے ہوئے ملاوجہی نے اپنی معرکتہ الآرا مثنوی ''قطب مشتری'' کے لئے بنگال کی حسین جمیل دوشیزہ کو انتخاب کیا۔ غالب بنگال سے لوٹنے کے بعد ساری عمر ہائے ہائے کرتے رہے۔ مومن کے دامنِ دل کو بھی ''بتِ بنگالہ'' نے کھینچا۔ اوران لوگوں کے لئے یہ سرزمین ایک کسک بن گئی۔ جو اسے نہیں دیکھ سکے تھے لوگ جوق در جوق آتے رہے۔ کبھی فاتح بن کر' کبھی بیوپاری بن کر' کبھی مزدور بن کر۔ ان کی عورتیں اپنے لوک گیتوں میں۔

''سب دیس جئی ہو بنگلوا نہ جئی ہو''

''کلکتو نہ جئی ہو''

''بدیسوا نہ جئی ہو''

کا گیت گاتی رہیں لیکن ان کے قدم نہیں رکے اور یہ بنگال میں آتے ہی رہے۔

قدیم زمانے میں جو لوگ بنگال آئے اور بنگالی ہو گئے۔ ان کے علاوہ انیسویں صدی میں مزدور بن کر یوپی بہار سے ایک ایسا گروپ بھی آیا جو اپنے ساتھ اپنا سب کچھ لے کر آیا تھا۔ اپنی روایات' اپنی کہانیاں' اپنے رسومات' اپنی بولی' اپنا مخصوص پہناوا۔ یہ گروہ بنگال میں اپنی تمام تر انفرادیت کو بچا کر آباد ہوا۔ یہ گروہ ان مزدوروں کا تھا جو بنگال میں نئے بننے والے جوٹ ملوں اور دوسرے کارخانوں میں مزدوری کرنے کے لئے آیا تھا اور جہاں جہاں ملیں بنیں یہ گروہ اسی کے آس پاس اپنی چھوٹی چھوٹی بستیاں بنا کر آباد ہو گیا۔ گرچہ ان مزدوروں کی بہت بڑی تعداد یوپی اور بہار سے اپنا تعلق بنائے رہی لیکن ایسے لوگوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی جنہوں نے اپنے وطن سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور انہیں بستیوں کو اپنے وطن کی تصویر بنا دیا۔ کانکی نارہ بھی ایک ایسی ہی بستی ہے اور یہاں اسی کا ذکر مقصود ہے۔

بھاٹ پاڑہ جس کا قدیم نام ''بھٹو پلی'' تھا۔ کہتے ہیں کہ بارہویں صدی میں قنوج کے راجہ بلال سین نے بھٹ برہمنوں کو قنوج سے ہندو مذہب کی رسومات کی ادائیگی کے لئے بلا کر بنگال میں آباد کیا تھا۔ ان برہمنوں میں سے دو خاندان اسی بھاٹ پاڑہ کے پانچ مندر کے پاس آباد ہوئے اور یہ علاقہ سنسکرت کا زبردست مرکز بن گیا۔ یہاں سے ایک سنسکرت کے جید عالم پیدا ہوئے۔

اس بھاٹ پاڑہ کے قریب ایک اور بستی تھی جس کا نام مختار پور تھا۔ مختار پور بستی نئی ہٹی سے لے کر روپ شری سنیما تک تھی اور روپ شری سنیما کے سامنے جو دھان کل کی خالی زمین پڑی ہوئی ہے وہاں

مختار پور والوں کا قبرستان تھا۔ کہتے ہیں کہ مختار پور میں عربی اور فارسی کے بہت بڑے بڑے عالم تھے۔ ان علماء میں ہندو بنگالی بھی تھے لیکن یہ بستی انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد اجاڑ دی گئی۔ لیکن اب تک تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اسی بھاٹ پاڑہ اور مختار پور کے قریب کانکی نارہ آباد ہوا ———

کہتے ہیں کہ آج جہاں کلرک گھاٹ روڈ میں بستی کیمپ ہے اور کانکی نارہ مل کا اسٹاف کوارٹر ہے وہیں ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کا نام ''بنگالی مسجد'' تھا۔ یہاں زیادہ تر چٹا گانگ اور فرید پور وغیرہ کے مچھوے' بھکاری اور مزدور آباد تھے۔ چونکہ یہ بستی کانکی نارہ اسٹیشن کے بالکل قریب آباد تھی اس لئے کپڑوں کے وہ بیوپاری جو یوپی اور بہار سے آئے تھے یہیں قیام کرتے تھے۔ گرچہ یہ ان کی مستقل رہائش گاہ نہیں تھی پھر بھی یہ جب آتے یہیں ٹھہرتے۔ انیسویں صدی جب اسی بستی کے قریب کانکی نارہ ''پرانا کل'' تعمیر ہونے لگا تو یوپی بہار کے محنت کش مزدور بڑی تعداد میں آنے لگے اور اسی بستی میں آباد ہونے لگے۔ اور یہاں کی آبادی بڑھنے لگی۔ انہی مزدوروں کے ساتھ کپڑوں کے کچھ بیوپاری بھی آئے اور ان لوگوں نے یہاں اپنی باڑیاں بنالیں۔ اب اس بستی کا نام میر پور پڑا۔ میر پور بستی میں سب سے بڑی باڑی محمد اکبر میاں کی تھی جو چالیس کمروں کی تھی۔ محمد اکبر میاں محمد مسعود انصاری کے دادا تھے۔ یہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ بڑے بارعب انسان تھے اور پڑھے لکھے تھے۔ یہیں پر میرے دادا حاجی جمال الدین بھی آباد ہوئے۔ منبو سردار اور حاجی بیر بل بھی اسی بستی میں رہائش پذیر تھے۔

کہتے ہیں کہ اسی میر پور بستی میں پہلی بار تقریباً ۸ سال کی عمر میں اسحاق سردار بھی آئے تھے اور عبدالرحمٰن میاں جو مصطفیٰ بابو کے دادا تھے اور اس بستی میں ایک چھوٹا سا ہوٹل چلاتے انہیں کے یہاں آ کر رہے۔ لیکن جلد ہی یہاں سے پھر بھاگ کر بلیا چلے گئے اور دوسری بار تقریباً ۱۴ سال کی عمر میں واپس آئے اور منبو سردار جو اس وقت اینگلو انڈیا جوٹ مل میں شفٹنگ سردار تھے۔ انہیں کے لائن میں کام کرنے لگے۔ اس زمانے میں منبو سردار کی دھاک پورے علاقے پر بیٹھی تھی۔ یوں ہوا تھا کہ کوئی اس علاقے میں بہت بڑا غنڈہ تھا جو ان مزدوروں سے باقاعدہ خراج وصول کرتا تھا۔ اس کا رعب کچھ ایسا جما ہوا تھا کہ انگریز حاکم بھی اس کی زیادتیوں کو نظر انداز کرتے رہتے تھے۔ منبو سردار بڑی اچھی صحت کے مالک تھے ایک دن وہ غنڈہ ان سے بھی الجھ گیا اور انہوں نے اسے آج جہاں فائر بریگیڈ اسٹیشن ہے وہیں ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اسی میں باندھ کر خوب پیٹا۔ اس کے بعد وہ یہاں کے گویا راجہ ہو گئے ———

اب میر پور بستی ان لوگوں کی مستقل رہائش گاہ بن گئی تھی اور یہیں ''نبا حافظ'' جی نے محمد اکبر میاں کی باڑی میں بچوں کی تعلیم کے لئے مدرسہ کھولا اور یہی مدرسہ کانکی نارہ کا پہلا مدرسہ تھا ——— اس طرح

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس علاقے میں ان پردیسیوں کے قدم جمنے لگے اور یہ سب کچھ بھول کر اس علاقے کی تعمیر میں جٹ گئے۔لیکن اس زمانے میں ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔کانکی نارہ جوٹ مل پرانا کل کے قریب ہی ایک اور کارخانہ تعمیر ہونے لگا۔دوسری طرف میر پور بستی کے حصے کو ملٹری کیمپ کے لئے گورنمنٹ نے لے لیا۔ اور پھر ایسا ہوا کہ میر پور بستی بالکل اجڑ گئی اور یہاں کے اجڑے ہوئے لوگ آس پاس کے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی بستیاں بسا کر آباد ہونے لگے۔حاجی کمال الدین سردار' بکرتی سردار' رزاق سردار' عبدل سردار' مہنگی سردار وغیرہ کے زیر اثر آرہ اور بھبھوا وغیرہ کے لوگوں نے اپنے لئے اسٹیشن پار کا علاقہ منتخب کیا۔اسحاق سردار' شکور سردار' ناظر سردار' فوجدار قریشی اور جلالو میاں وغیرہ کے زیر اثر بلیا اور غازی پور کے لوگوں نے اپنے لئے نیا بازار کا علاقہ چنا۔بیربل سردار کے زیر اثر چھپرہ کے لوگ کانکی نارہ بازار میں آباد ہوئے۔اب یہاں کئی ملیں تعمیر ہو چکی تھیں اور انگریز مالک ان سرداروں پر برابر زیادہ سے زیادہ مزدور بلانے کے لئے دباؤ ڈالتے رہے اور دراصل یہ سردار مزدور کنٹراکٹر ہو گئے۔ان نوارد مزدوروں کی تمام تر ذمہ داریاں ان سرداروں پر ہوتی تھی اور انگریز مل مالکوں نے ان سرداروں کو بے پناہ دولت کمانے کے ہر ممکن مواقع فراہم کیے۔اس طرح ان سرداروں میں اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔بڑے بڑے پہلوان بلائے جاتے اور خوب کشتیاں ہوتیں۔ان پہلوانوں میں عدالت خلیفہ' رزاق پہلوان' ولی خلیفہ' اسماعیل پہلوان' بہت مشہور تھے۔دوسری طرف کجری کی محفلیں جمتیں اور رسیا مجید اور تراب جیسے مشہور و معروف کجری کے استاد آتے تھے۔لیکن ان سرداروں کو اپنی صحیح طاقت کا مظاہرہ کرنے کا سال میں ایک موقع آتا تھا اور وہ تھا محرم کا اکھاڑہ۔جب تک میر پور بستی تھی اکھاڑے کے دو خلیفہ مشہور تھے۔رمضان خلیفہ اور چڈر خلیفہ اور سب لوگ ایک ہی اکھاڑے میں شامل ہوتے لیکن علاقہ الگ ہونے کے بعد سرداروں کے نام سے اکھاڑے نکلنے لگے۔نیا بازار سے سب سے بڑا اکھاڑہ اسحاق سردار کا نکلتا۔بازار سے دوسرا اکھاڑہ بیربل سردار کا نکلتا۔کیلا بگان سے باقر سردار کا' اسٹیشن پار سے رزاق سردار کا اکھاڑہ بڑی دھوم سے نکلتا اور ایک اکھاڑے میں پانچ پانچ ہزار آدمی تک ہوتے۔اکثر ان اکھاڑوں میں لڑائیاں بھی ہوتیں۔لیکن پھر بھی ہر طرف آسودگی تھی۔سکون تھا۔روزی کی فراوانی تھی۔آج جہاں نیا بازار آباد ہے۔کہتے ہیں کہ یہ جگہ تالابوں اور جنگلوں کا علاقہ تھا اور جہاں دوست محمد خانساماں کا گولہ ہے وہاں سے لے کر حاجی شکور کی باڑی تک میر پور والے قبرستان کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اس قبرستان کا کنواں آج بھی وہاب صاحب کی باڑی میں جوں کا توں موجود ہے۔یہ علاقہ سانپ بچھو کے علاوہ خطرناک جنگلی جانوروں سے بھرا

ہوا تھا۔سنا ہے کہ ایک بار ٹھیک کانکی نارہ اسٹیشن کے پاس برج کے نیچے ایک شیر کٹ کر مر گیا تھا اور آج بھی وہ ریلوے لائن ''بگھوا لائن'' کے نام سے مشہور ہے۔

نیا بازار کو آباد کرنے میں ان آکاش پتروؤں نے جتنی مصیبتیں جھیلیں ہیں اس کی نظیر کم ہی ملے گی۔ لوگ ملوں سے کام کر کے چھوٹتے اور کدال سنبھال لیتے۔ملوں سے چھائی آتی ان سے تالابوں کو بھرا جاتا۔ کالا زار' ملیریا اور پیٹ کی دوسری بیماریاں ان کے وجود سے چمٹی رہتیں لیکن ان کے ہاتھ شل نہ ہوتے۔ آخر کار تمام تالاب بھر گئے اور بستیاں آباد ہو گئیں۔اب یہ بستیاں ان کی مستقل رہائش بن گئیں۔افراتفری قریب قریب ختم ہو گئیں۔انہیں اپنی سماجی حیثیت کا احساس ہوا۔تعلیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔کھیل کود کا شوق جاگا ——— ان مزدوروں کی دل بستگی کے لئے تھیٹر بلوائے جانے لگے جسے لوگ بڑی دلچسپی سے دیکھتے۔اس کے بعد رزاق سردار نے بھاٹ پاڑہ میونسپل کے بغل میں ''ڈلسن مشو'' نام کا تھیٹر بنوایا اس میں ''انبولتا (خاموش)'' فلمیں بھی دکھائی جاتیں لیکن فلموں سے لوگوں کی دلچسپی بہت کم تھی۔لہٰذا بھیڑ لگانے کے لئے طوائفوں کو بلا کر اسٹیج پر نچوایا جاتا تھا۔اپنے زمانے کے مشہور فلم ایکٹر ماسٹر عبدالحق کو بلایا جاتا وہ خود اسٹیج پر کرتب دکھاتے۔یہیں کی آمدنی سے رزاق سردار نے دو سنیما گھر تعمیر کرائے۔ایک بھاٹ پاڑہ میں جس کا نام چھبی گھر تھا جو آج روپا شری ہے اور جگتدل میں جس کا نام اپنے لڑکے کے نام پر انہوں نے شاہجہاں ٹاکی رکھا تھا جسے ہم آج رجنی سنیما کے نام سے جانتے ہیں۔

آج سے تقریباً سو سال قبل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو میرے نانا محترم تھے پرتاپ گڑھ سے آئے تھے۔بھاٹ پاڑہ میونسپل کے قریب گل پتے اور پھوس کی کچھ جھوپڑیاں تھیں وہیں آکر رہنے لگے اور بقول صدیق صاحب مرحوم وہ بڑے پائے کے مقرر تھے اور جب بولنے لگتے تو سماں بندھ جاتا تھا۔کہتے ہیں کہ ان کی تقریروں سے متاثر ہو کر بیربل سردار نے اپنی مسجد جو کانکی نارہ ۶ نمبر گلی میں ہے امام مقرر کیا اور پھر مولانا موصوف کی کوششوں سے وہ مسجد اتنی عظیم الشان بنی اور مسجد سے منسلک ایک کمرے میں رہنے لگے۔اس کے بعد نانی محترم کو لائے جو اجمیر کے ایک داروغہ کی بیٹی تھیں۔محترمہ عربی' فارسی' اردو کے علاوہ تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتی تھیں۔انہی کی وجہ سے اس علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج ہوا اور آج بھی بہت سی عورتیں ان کی پڑھائی ہوئی موجود ہیں۔

چونکہ حضرت مولانا محمد یعقوب کا تعلق دیوبند سے تھا۔حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے گہرے تعلقات تھے اس لئے اکثر نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند اور دوسری جگہ جانے لگے جن میں مولوی دوست محمد صاحب' حکیم مولانا شمس الحق صاحب' قاری حفظ الرحمٰن' مولوی فضل الرحمٰن'

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مولوی صمدانی، مولوی حنیف، مولوی عین الحق اور مولوی عبدالصبور کے نام قابل ذکر ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیوبند سے آنے کے بعد یہ لوگ پیری مریدی کے سخت خلاف ہو گئے۔ میر پور بستی میں نبّا حافظ جی جو مدرسہ چلاتے تھے وہ منتقل ہو کر نیا بازار آ گیا اور اسحاق سردار صاحب کے مکان میں وہیں چلنے لگا جہاں آج صدر انجمن اسکول ہے۔ اب یہاں حافظ مولانا محبّ علی صاحب جو مولانا دوست محمد صاحب کے والد بزرگوار تھے، پڑھانے لگے۔ مولانا محبّ علی صاحب شریعت کے بڑے پابند تھے اور پیری مریدی پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف کانکی نارہ میں بحیثیت پیر حضرت خواجہ حاجی امام علی عرف نسیم شاہ چشتی کی بڑی عزت تھی۔ ان کے معتقدین کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ان کی وفات کے بعد حاجی محمد اسحاق سردار سجادہ نشیں مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ان کے مزار پر خوب قوالیاں ہوتیں۔ صندل اور چادریں چڑھائی جاتیں اور عرس کے موقع پر کئی دنوں تک میلہ لگا کرتا تھا۔ دیوبند سے لوٹنے والے مولویوں کو یہ بات پسند نہیں تھی لہٰذا حنفی اور وہابی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ جھگڑا کانکی نارہ مل کی مسجد سے شروع ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ کلکتہ ہائی کورٹ تک پہنچ گیا۔ حنفیوں کی طرف سے حسین شہید سہروردی وکیل مقرر ہوئے۔ کیس چلا اور حنفیوں کی فتح ہوئی۔ کہتے ہیں کہ جشن فتح بڑی دھوم دھام سے منایا گیا اور اس جلسے میں خود حسین شہید سہروردی بھی شریک ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محبّ علی صاحب کا مدرسہ بند ہو گیا لیکن اسی وقت مرحوم عبدالجبار چائے والے کی نانی تیتری جن نے بڑی جرأت سے کام لیا اور ۲ نمبر گلی میں اپنی باڑی میں ایک بڑا سا ہال بنوا کر مولانا محبّ علی صاحب کو سونپ دیا جس کا کوئی کرایہ نہ تھا۔ اس مدرسے میں مولانا محبّ علی کے بعد ان کے فرزند حضرت مولانا دوست محمد اخیر عمر تک پڑھاتے رہے اور یہ مدرسہ تقریباً ۷۰ سال چلتا رہا اور بچے دینی اور دنیوی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

کہتے ہیں کہ یہی وہ زمانہ تھا جب پہلی بار بہار کے لوگوں نے ایک دوسرے کو چڑھانے کے لئے مسلم لیگ اور کانگریس میں اپنے آپ کو بانٹا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ مذاق کے کتنے بھیانک نتائج ہوں گے اور یہ مذاق کتنی بھیانک بربادی کا پیش خیمہ ہوگا۔ کارخانوں میں، محلوں میں محرم کے اکھاڑوں میں، دکانوں میں ایک دوسرے کو مسلم لیگی اور کانگریسی بنا کر خوب خوب آواز کسے جاتے۔ مشاعروں میں ایک دوسرے پر طنزیہ اشعار پڑھے جاتے۔ ایک مشاعرے میں کسی مسلم لیگی شاعر نے جب یہ شعر پڑھا

اک آشیاں سے ہزار آشیاں بنائیں گے
ہوا رہی جو موافق اگر زمانے کی

تو سمیع اللہ صاحب قمر نے یہ شعر پڑھا

تری قیادت عظمیٰ کے صدقے اے قائد
جگہ نہیں ہے زمانے میں سر چھپانے کی

ان دونوں شعروں پر کلکتے کے لیگی اور کانگریسی اخبارات میں خوب ہائے ہلڑ مچی ——— لیکن اب تک لیگی اور کانگریسی کے نظریے کافی مضبوط ہو چکے تھے اور جیسا کہ عبدالرزاق ملیح آبادی اپنی کتاب ''ذکر آزاد'' میں لکھتے ہیں کہ جب کانگریسی ہونے کے جرم میں مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور خود عبدالرزاق ملیح آبادی بنگال سے گرفتار ہوئے تو انہیں کے ساتھ کانکی نارہ سے مولانا محمد یعقوب بھی گرفتار کیے گئے۔

جگتدل تھانے کے علاقے میں سوائے بھاٹ پاڑہ اسکول کے اور کوئی ایسا اسکول نہیں تھا جہاں ان علاقوں میں آباد لوگوں کے بچے اردو میڈیم سے انگریزی تعلیم حاصل کرتے۔ اب انگریزی تعلیم کی سخت ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ لہٰذا سید محمد حسین مرحوم، حبیب اللہ بابو مرحوم کی کوششوں سے کانکی نارہ کچہری روڈ میں ایک مڈل انگلش اسکول قائم کیا گیا۔ جس میں کامتا پرساد انگریزی کے معلم مقرر ہوئے۔ اس اسکول کی وجہ سے یہاں انگریزی تعلیم کا رواج ہوا۔ اس اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والوں میں مرحوم نور محمد صاحب، مصطفیٰ بابو، عبدالرزاق شا کی، ماسٹر حسام الدین، مظہر الحق بابو، ماسٹر ابوالقاسم صاحب، حاجی شکور صاحب کے بیٹے محمد رفیق مرحوم اور مرحوم عبدالرؤف صاحب، ماسٹر عبدالرؤف وغیرہ تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے کلکتہ جبلی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا جو اس زمانے کے لئے بہت بڑی بات تھی۔ حاجی محمد اسحاق سردار کے دونوں بچے محمد محی الدین اور محمد قمر الدین نے ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور بعد میں کلکتہ جبلی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد اسلامیہ کالج (کلکتہ) سے بی اے کا امتحان ۱۹۳۸ء میں پاس کیا۔ انہیں کے ساتھ عین الحق صاحب نے بھی بی اے پاس کیا اور بعد میں راشننگ آفیسر ہوئے۔ اس علاقے میں آباد لوگوں کے بچوں میں سب سے پہلے ان ہی تینوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ کہتے ہیں کہ محی الدین اور قمر الدین کے بی اے پاس کرنے پر بھاٹ پاڑہ کے بنگالیوں کو بڑی حیرت ہوئی تھی اور وہ آ کر ان لوگوں کو دیکھتے تھے۔

ایم ای مڈل اسکول تقریباً ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک چلا اور بند ہو گیا لیکن اس قلیل مدت میں انگریزی تعلیم سے اتنے لوگ مستفیض ہو چکے تھے کہ ان علاقوں کی سماجی حیثیت مستحکم ہو گئی۔ ایم ای اسکول تو بند ہو گیا لیکن دونوں مذہبی مدرسے ایک جسے مولانا محبّ علی نیا بازار میں چلاتے تھے۔ دوسرا کانکی نارہ بازار کے بیربل سردار کے مسجد میں جسے حافظ عبدالغفور اور مولانا فرزند احمد صاحب چلاتے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھے۔ بدستور چلتے رہے۔ لگ بھگ ۱۹۲۸ء میں حکیم عبدالقادر صاحب کانکی نارہ آئے اور منبو سردار کے محلے میں رہنے لگے۔ حکیم صاحب مرحوم بڑے علم دوست تھے۔ کانکی نارہ کے عوام اپنا ایک ہائی اسکول چاہتے تھے اور حکیم صاحب بھی ہائی اسکول قائم کرنا چاہتے تھے۔ محمد اسماعیل میاں عرف کھیساری میاں اور نور محمد صاحب نے جگہ عنایت کی اور حکیم صاحب نے حمایت الغرباء نام کا ایک مدرسہ کھولا جس میں حکیم صاحب کے علاوہ ماسٹر حسام صاحب پڑھانے لگے۔ یہی مدرسہ آگے چل کر حمایت الغرباء پرائمری اسکول بنا پھر مڈل ہوا اور آج ہائر سکنڈری اسکول ہے۔

اسٹیشن پار ماسٹر ابوالقاسم صاحب اپنے مکان میں اسکول چلاتے تھے گرچہ یہ اسکول نہ پرائمری تھا نہ مڈل۔ لیکن ان کے پڑھانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ان کے پڑھائے ہوئے بچے بہت بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ تعلیم کا یہ سلسلہ ابھی چل ہی رہا تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات بہت بڑھ گئے۔ پانچ نمبر سائیڈنگ پر مسلم لیگ کا بہت بڑا اجلاس ہوا۔ اس کے جواب میں اسٹیشن پار موچیا تالاب پر کانگریسیوں نے سہ روزہ آل انڈیا مومن کانفرنس کیا۔ اور پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ اپنے غیر ہوگئے۔ باپ بیٹے جدا ہوگئے۔ پھر ۱۹۵۰ء کے ہنگامے نے تو اس علاقے کو گویا اجاڑ کر رکھ دیا۔ اسٹیشن پار کی بستی جو تقریباً ۲۰ ہزار افراد پر مشتمل تھی بالکل ختم ہوگئی۔ لوگ اپنی آباد کی ہوئی بستیوں کو چھوڑ کر پاکستان جانے پر مجبور کر دیے گئے۔ اردگرد کے مٹھی بھر لوگ نیا بازار میں آکر آباد ہوئے اور آج اس علاقے کی آبادی ۵۰ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ اب یہاں بیسوں پرائمری اسکول ہیں۔ بچیوں کے لئے بھی ایک جونیئر ہائی اسکول ہے۔ اردو کی لائبریریاں ہیں اور ایک بار پھر یہ آکاش پتر تابناک مستقبل کی آرزو میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ ٹیلی گرام لے کر دن دن بھر اسٹیشن پر کھڑے رہتے تھے کہ ٹرین سے اترنے والا کوئی رحم دل بنگالی بابو اسے پڑھ دے۔ آج اس علاقے کے تین پروفیسر ہیں بشارت کریم جو قائداعظم کالج (کراچی) میں معاشیات کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ہیں، خواجہ مجیب الحق جو باراسات گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ محمد منصور عالم جن کا تقرر فی الحال گوہاٹی یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا ہے جنہوں نے ڈبلیو بی سی ایس کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ دو وکیل ہیں محمد قمرالدین انصاری اور اکبر قریشی جو کامیاب پریکٹس کر رہے ہیں۔ ایک ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر فضل رحیم (ایم بی بی ایس) ان کے علاوہ ایم اے اور گریجویٹوں کی بڑی تعداد ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بھی نہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے بہت آگے بڑھنا ہے۔

کانکی نارہ کے لوگ بھی عجوبۂ روزگار ہیں ان لوگوں نے جو کام بھی کیا اس کی نظیر ملنی ممکن نہیں۔

تقریباً ۱۹۳۰ء میں حاجی شکور کے فرزند مرحوم محمد رفیق اور مرحوم رؤف صاحب نے ''ترکی'' کلب کے نام سے ایک فٹ بال کلب بنایا تھا۔ یہی کانکی نارہ کا پہلا کلب تھا اور اسی کلب نے الیاس جیسا شہرۂ آفاق کھلاڑی پیدا کیا۔

کانکی نارہ نیا بازار کے سبحان نیاریا صاحب نے چاندی اور سونے کے قدیم سکے جمع کیے تھے جنہیں میں نے خود دیکھا تھا۔ کل سکوں کا وزن ڈھائی کلو سے زیادہ ہوگا۔ افسوس کہ ان کی موت کے بعد وہ تمام سکے چاندی اور سونے کے بھاؤ بیچ ڈالے گئے۔ **جناب محمد قاسم انصاری کا تیار کیا ہوا ''فلم پیڈیا'' بھی دیکھنے کے لائق چیز ہے اس میں ہندوستان میں بننے والی پہلی فلم سے لے کر ۱۹۵۰ء تک کی فلموں کی تمام تفصیلات موجود ہیں۔** مرتضیٰ جلال کی تیار کی ہوئی ہندوستان اور بیرون ہندوستان کھیلے جانے والے کھیلوں مثلاً ہاکی، فٹ بال، کرکٹ، مکہ بازی کی ڈائری بھی دیکھنے کی چیز ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بجھے لمحوں کی یاد

وحید عرشی

زندگی کی کہانی بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔آنکھیں بند ہوتے ہی آدمی افسانہ بن کر رہ جاتا ہے اور ذہن میں بکھرے ہوئے یادوں کے شیرازے چھت کے ادھڑے ہوئے گڈھے کی طرح ہر لمحہ ایک نیا نقش پیش کرتے رہتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے آدمی اپنے حال سے بے خبر سا ہو جاتا ہے اور پھر غم دوراں کا ایک ہی جھونکا وہ سارے نقوش مٹا کر حال کا آئینہ سامنے رکھ جاتا ہے جس سے آنکھ چرانا کتنا دشوار ہو جاتا ہے۔

زندگی کا یہ مختصر سا سفر اتنا طویل کیوں محسوس ہوتا ہے؟

اتنا دشوار کیوں ہوتا ہے؟

اس نے بھی شاید یہی سوچا ہوگا

اور پھر ایک برگد کو گواہ بنا کر بغیر کھائے پیئے چودہ دنوں تک سوچتا رہا اور اتنا ہی بتا سکا کہ موت کس طرح آسان ہو سکتی ہے۔

لیکن اس پیڑ کے پتے بھی زرد ہوتے ہیں۔ٹوٹتے ہیں بکھر جاتے ہیں۔

—— اور وہ بڑھیا بھی پرسکون ہو گئی تھی جو غم سے نڈھال اپنے اکلوتے مردہ بچے کا جسد خاکی لے کر اس سے اس کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی تھی اور اس نے دوبارہ زندہ کرنے کی یہ شرط رکھی تھی کہ کسی ایسے گھر سے ایک مٹھی خاک لائے جس کے یہاں کوئی موت سے ہمکنار نہ ہوا ہو —— اور اسے ایک مشت خاک نہیں مل سکی —— اور وقت نے اس کے زخم پر پھاہا رکھ دیا تھا —— واقعی وقت ہر زخم پر پھاہا رکھ دیتا ہے —— لیکن ہر زخم ایک داغ بھی چھوڑ جاتا ہے جس سے کچھ یادیں ہمیشہ کے لئے الجھ کر رہ جاتی ہیں۔

ایک ایسا ہی داغ وکیل اختر کی موت کی بھی ہے۔میں نے آج تک اس بات پر غور نہیں کیا کہ وہ کتنا عظیم شاعر تھے۔میں نے ان کی زندگی کے نجی گوشوں سے بھی واقف نہیں۔میں دوست ہونے کا بھی دعویدار نہیں —— ہاں ایسی چند ملاقاتوں کا مدعی ضرور ہوں جنہیں فراموش کرنا آسان نہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں میں نے ان کی شخصیت میں چھپی ہوئی اس کشش کو محسوس کر لیا تھا جسے محسوس تو کیا

جا سکتا ہے لیکن کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

۱۹۶۷ء کی ایک شام —— ''تانتی بگان میں مولانا آزاد میموریل کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ —— علامہ جمیل مظہری، رضا کاظمی، شہاب لکھنوی، اویس احمد دوراں، سالک لکھنوی، وکیل اختر، مضطر حیدری، وفا سکندری اور بہت سارے دوسرے شعراء۔ان میں سے سالک صاحب کے علاوہ میں کسی کی صورت سے آشنا نہیں تھا۔ہاں نام ضرور سن رکھا تھا۔میری جیب میں ایک غزل پڑی ہوئی تھی۔اس وقت تک یہی ایک غزل میں نے کہی تھی۔میں نے فیروز عابد سے کہا۔چلو سامعین کی صف میں بیٹھ کر مشاعرہ سنیں گے۔میں نہیں پڑھوں گا —— ''پڑھنا۔لیکن یہیں بیٹھیں گے۔کم سے کم تصویریں تو کھنچوالیں''۔میں خاموش ہو گیا۔پھر میرے قریب ہی دوراں آ کر بیٹھ گئے اور فیروز سے باتیں کرنے لگے، بعد میں میرا بھی تعارف ان سے ہوا۔دوراں جس محبت سے ملے میں بھول نہیں سکتا اور پھر انہوں نے مجھے وکیل اختر سے ملایا۔''کلکتہ یونیورسٹی میں ففتھ ایر کے طالب علم ہیں۔بہت اچھا پڑھتے ہیں''۔میں سلام کر کے ہاتھ ملانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا —— مشاعرہ شروع ہوا۔واہ واہ کی صدا فضا میں گونجنے لگی، میں ہر شاعر کے بعد یہی سمجھتا۔شاید اب میرا نام پکارا جائے اور پھر میرا نام بھی پکارا گیا —— مطلع پر ہی مجھے اتنی داد ملی کہ میں گڑ بڑا کر ترنم بھی بھول گیا اور ایسا لگا کہ اب نہیں پڑھ پاؤں گا۔لیکن وکیل اختر نے سہارا دیا۔اطمینان سے پڑھو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔اور میں نے پوری غزل پڑھ ڈالی۔غزل خلاف توقع بہت ہی کامیاب ہوئی تھی اور میرے بیٹھتے ہی جب شہاب صاحب نے یہ کہا کہ وحید عرشی دوسری غزل سنائیں گے تو واقعی میں پریشان ہو گیا۔دوسری غزل میرے پاس تھی ہی کہاں۔اب میں کسی طرح مشاعرہ گاہ سے نکل بھاگنا چاہتا تھا لیکن فیروز سننے پر بضد تھا —— میں نے وکیل اختر کو اپنی طرف متوجہ پا کر اور ان کے قریب کھسک گیا۔انہوں نے جس انداز سے سراہا میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔میں ان کی شخصیت سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ میرے لئے بولنا دشوار تھا۔پھر مشاعرہ تھوڑی دیر کے لئے تھم گیا اس لئے کہ علامہ جمیل مظہری کا ضعف انہیں اور زیادہ بیٹھنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔علامہ کے جانے کے بعد اسٹیج کی فضا اچانک چہک اٹھی۔لوگ آپس میں کھل کر دلچسپ جملوں کا تبادلہ کرنے لگے۔اس دوران میں نے بھی کئی سوالوں کے جواب دیے اور کئی باتیں پوچھی بھی۔نتیجہ کے طور پر ایک حد تک میری گھبراہٹ دور ہو گئی۔مشاعرہ کا پہلا دور ختم ہوا۔دوسرے دور کے اعلان کے بعد ہی میں نے فیروز کو نکل چلنے پر راضی کر لیا۔میں دل سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا اور بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔اٹھتے وقت وکیل اختر نے پوچھا'' کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا' گھر جاؤں گا۔سویرے کچھ کام ہے —— بیٹھو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک غزل اور پڑھ کر چلے جانا۔ پھر میں نے سچی بات بتادی ——— انہوں نے عجیب انداز سے ہنستے ہوئے کہا پھر آپ لوگ ایک ہی غزل کہہ کر شاعر کیوں بن جاتے ہیں''؟

مجھے بھی سوجھ گیا۔ میں نے کہا

''باپ ہونے کے لئے دس بیس بچوں کا ہونا ہی کوئی ضروری نہیں''۔

اس جملے پر وہ خوب ہنسے ——— اور تقریباً رات کے دو بجے ہم مشاعرہ گاہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد کافی دنوں تک وکیل اختر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ایک دن اچانک یونیورسٹی کے لان میں میں نے انہیں کھڑا دیکھا۔ جا کر سلام کیا۔ اور انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا ——— ''کہو تمہارے یہاں دوسرا بچہ پیدا ہوا کہ نہیں''؟ میں نے کہا ——— ''جی ہاں میں نے ایک غزل اور کہی'' ——— اس کے بعد ہم پیدل چلتے ہوئے ڈائمنڈ ہوٹل تک آئے۔ راستے میں وہ جس انداز سے گفتگو کرتے رہے۔ اگر سمجھنے میں تھوڑی سی لغزش ہوتی تو میں حسب مراتب کے اصول فراموش کر بیٹھتا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ان کی شخصیت نے جس طرح پہلی ملاقات میں مرعوب کیا تھا۔ باقی رہی اور میں ایک حد تک ان سے اتنا قریب آ گیا تھا کہ حد ادب میں کوئی بھی بات کہہ دیتا۔ اس کے بعد لمبی ملاقاتوں میں' میں نے کئی غزلیں بھی سنیں۔ کچھ اشعار بے ساختہ دل کو چھو لیتے تھے۔ مگر مجھ میں کبھی اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ واہ کر سکوں۔ ہاں اگر کبھی دوسرے کے شعر پر بات چل پڑی تو میں بھی کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا اور غور سے ان کی بات بھی سنتا۔ اسی دوران مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ وکیل اختر نے میر کے اشعار کو جس انداز سے سمجھا ہے بہت کم لوگ ملیں گے۔ وہ جس شعر پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے اس کے لئے اتنے سادہ الفاظ اور اتنا عام فہم انداز اختیار کرتے کہ سننے والے کو اپنا ذہن سونپ دیتے۔

اس کے بعد میں جب بھی ملتا موقع نکال کر دو چار شعروں پر ان کی رائے ضرور معلوم کرنے کی کوشش کرتا اور اس روز واقعی مجھے ان کی عظمت کا صحیح پتہ چلا۔ جب غالب کے ایک شعر کے بارے میں انہوں نے بلا جھجک یہ کہہ دیا کہ ''یہ شعر میری سمجھ میں نہیں آتا'' ——— انہوں نے اس کی قطعی پرواہ نہیں کی کہ میرا امیج بگڑ بھی سکتا ہے۔ میں نے کہا انگریزی کا ایک محاورہ ہے۔

"No body wants to say no" انہوں نے کہا میں اس میں یقین نہیں رکھتا۔

ایم اے کے امتحان کے تقریباً تین ماہ قبل میں بیڈفورڈ لین (کلکتہ) میں مستقل رہنے لگا۔ یہاں سے وکیل اختر کی رہائش گاہ بہت قریب تھی۔ لہٰذا وہ اکثر رات کو کبھی اکیلے اور کبھی بدنام نظر کے ساتھ آ جایا کرتے تھے اور کافی رات گئے تک تکی اور بے تکی باتیں ہوتی رہتیں۔ یہی وہ دور تھا جب میں نے وکیل اختر

کو بہت قریب سے دیکھا اور انہیں قریب سے سمجھنے کی کوشش کی۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ وکیل اختر کس پائے کے شاعر تھے میں نہیں جانتا۔ اس لئے کہ ان کا سراپا ہی مجھے اس لوک گیت کی طرح لگا تھا جس میں صدیوں قبل پڑنے والے سوکھے کا ذکر ہوا اور آج بھی اس کا ایک ایک لفظ درد بتا جاتے۔ اپنی بیماری سے متعلق بھی بہت کچھ کہتے ——— اس کے بعد جب میں ان کے اشعار کو سنتا تو ایسا لگتا جیسے ان کے دل کے پھپھولے چھوٹ کر اشعار کی شکل میں جم گئے ہوں اور جس میں پامال زندگی کی سسک گھٹ گئی ہو لیکن زندگی کی للک سے لبریز ——— وہ سراپا غم تھے ——— ان کی شخصیت اتنے خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ان کا ذہن اتنا منتشر تھا کہ اپنی حالت پر بہانے کے لئے ان کے پاس آنسو بھی نہیں تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود زندہ رہنا چاہتے تھے۔ میں نے ایک دن کہا ''وکیل اختر صاحب آپ بھی کیا خوب آدمی ہیں ——— کینسر کا مرض اس نکسلائٹ دور میں مدرسہ عالیہ کی ہیڈ ماسٹری ——— اور پاگل بیوی کا شوہر مر جانے کے لئے تو ان میں سے کوئی ایک ہی کافی ہے۔

''لیکن اتنی جلدی میں نہیں مروں گا'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ایم اے کے امتحان کے بعد میرا کلکتے کا مستقل قیام ختم ہو گیا۔ ایک دن اچانک یہ خبر ملی کہ وکیل اختر چترنجن اسپتال میں ہیں۔ میں انیس رفیع کے ساتھ بھاگا بھاگا اسپتال پہنچا۔ انہوں نے بتایا کہ ''بس ذرا سا پیتاس'' پھوٹ گیا اور ناک سے خون آ گیا ہے۔ گھر والوں نے یہاں داخل کر دیا۔ میں نے کہا دو چار دن آرام کر لیجئے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ انہوں نے عجیب انداز سے کہا ''آرام'' ——— برسوں سے دشواریاں عفریت کی شکل میں میرا پیچھا کر رہی ہیں اور میں بھاگ رہا ہوں۔ خدا جانے مرنے کے بعد بھی ان سے پیچھا چھوٹے گا یا نہیں۔ اور واقعی پیچھا نہیں چھوٹا جس دن ان کی موت ہوئی تھی یہی طے پایا تھا کہ لاری کے ذریعے ان کی لاش ان کے آبائی گاؤں لے جائی جائے۔ اسی دن لاری والوں کی ہڑتال تھی۔ نتیجے کے طور پر رات ۱۲ بجے تک ان کی لاش کلکتہ مدرسہ کے لان میں رکھی رہی ——— ملاقات کا وقفہ ختم ہونے کے بعد ہم چلے آئے۔ پھر دو چار دن بعد وہ گھر آ گئے۔ ان کی طبیعت قدرے سنبھلی ہوئی لگتی تھی اور یہی وہ دور تھا جب انہوں نے بہت تیزی سے شاعری کی۔ اسی زمانے میں مولانا آزاد کالج کا وہ ''یادگار'' طرحی مشاعرہ بھی ہوا جن میں ان کی غزل کے ایک شعر نے ستائش کی تمام حدوں کو چھو لیا اور یہ شعر کلکتہ کی ادبی فضا میں دھڑکنے لگا۔

اس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے
جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لیکن اس شعر کے ساتھ جو خوش گوار حادثہ پیش آیا وہ آج تک کلکتہ کی ادبی حلقے میں سسک رہا ہے اور سسکتا رہے گا۔" آبشار کلکتہ میں اس مشاعرے میں پڑھی گئی غزلوں کے چند اشعار پر تنقید کی گئی۔ لپیٹ میں وکیل اختر کا یہ شعر بھی آ گیا۔ پھر کیا تھا۔ دھڑا دھڑ مضامین چھپنے لگے اور بات ذاتیات تک پہنچ گئی۔ آخر یہ سلسلہ اس مضمون پر ختم ہوا جو بدنام نظر کے نام سے چھپا تھا۔

اس دوران وکیل اختر زیادہ تر بستر علالت پر رہے اور اس موضوع پر بالکل خاموش تھے لیکن

عجب خاموشی اس کے ہونٹوں پہ تھی
عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا

اس کے بعد اچانک ایک دن ان سے ملاقات ہوئی وہ بہت خوش تھے۔ بتانے لگے کہ "میں ابھی ابھی ایک انگریز کینسر اسپیشلسٹ سے معائنہ کرا کے آ رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ بس سردی جکڑ گئی ہے۔ مجھے کینسر نہیں ہے۔" "چلو آج کباب کھائیں گے"۔ کیا واقعی اس نے یہ کہا ہے۔ میں نے پوچھا۔ اور ان کے ہونٹوں پر ایک زہریلی ہنسی پھیل گئی۔ جانتے ہو کیا ہوا۔ پون گھنٹے تک میرا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر میرے گھر والوں کو اپنے چیمبر میں لے جا کر کافی دیر تک سمجھاتا رہا اور انہیں خوب ٹرینڈ کر کے باہر لایا اور مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ "بس سردی جم گئی ہے"۔ میں اندر ہی اندر لرز گیا۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے ڈاکٹر نے ٹھیک ہی کہا ہو تو انہوں نے کہا "بابو گاڑی آگے بڑھنے والی نہیں ہے"۔ لیکن اس وقت بھی میں نے ان کے چہرے پر نا امیدی کی جھلک نہیں دیکھی۔ لیکن موت ان کے سامنے کھڑی تھی ـــــ اور وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن بے بس تھے۔ پھر ان کا ذہن نہ جانے کہاں سے طاقت حاصل کر کے چیخ پڑا۔

کسی صورت کوئی صورت نکالو
مجھے بے موت مرنے سے بچالو

لیکن کسی صورت کوئی صورت نہیں نکل سکی۔

اور پھر ایک دن!!
"نکہت گل
سر نوک خار چمن
رو کے چپ ہو گئی
اور کرتی بھی کیا؟"

لاش

وحید عرشی

روزانہ کی طرح آج بھی میں گھر سے دوڑتا ہوا اسٹیشن گاڑی آنے سے کچھ منٹ پہلے پہنچا ہوں لیکن آج اسٹیشن کی فضا انتہائی خاموش ہے۔ آج قلی اپنے سروں پر رومال باندھتے ہوئے اس جگہ جمع نہیں ہو رہے ہیں جہاں وینڈر کا ڈبہ لگتا ہے۔ لوگ خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں یا کوئی اگر کچھ بولتا بھی ہے تو اتنی آہستگی سے کہ تیسرا نہ سن سکے۔ میرے دل میں ایکسڈنٹ کا خیال آتا ہے لیکن دونوں لائنیں بالکل صاف ہیں۔ پھر یہ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ روزانہ تو یہی لوگ اپنی سیاسی، سماجی، مہنگائی اور گھریلو مسئلوں کے نہ ختم ہونے والے بحثوں سے اسٹیشن کو شام کے وقت کا چڑیوں کا بسیرا بنائے رہتے تھے۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ٹی اسٹال کے پاس آتا ہوں۔ یہاں کی چائے مجھے بہت پسند ہے۔ میں چائے پیتے ہوئے چائے والے سے پوچھتا ہوں۔

"کی ہوئے چے"؟

"آپنی جانین نا"؟ وہ حیرت سے میرے طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ پھر میرے بغل میں کھڑا ہوا ایک آدمی مجھے مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"وہ اسٹیشن کے نیچے جہاں ریلوے کی پٹریاں رکھی ہوئی ہیں اسی کے نیچے سے بدبو آ رہی ہے۔ شاید کسی آدمی کو مار کر اس کے نیچے چھپا دیا ہے"۔ یکا یک میرے چہرے کا رنگ بھی اتر جاتا ہے۔ اب لوگ گول حلقے بنا کر بنا کر اسٹیشن پر اس طرح کھڑے ہو رہے ہیں جیسے سڑکوں کے کنارے پودے کو بچانے کی غرض سے لوہے کی جالیاں لگا دی جاتی ہیں۔ پھر لوگوں نے جو یہ حلقے بنا رکھے ہیں ان میں کون سا پودا پرورش پا رہا ہے؟ کیا وہ بدبو کا پودا کہیں تو نہیں؟

اب میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا پل کے نیچے جہاں منوں ریلوے کی فولادی پٹریاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے پاس جاتا ہوں۔ سچ مچ بدبو ایسی ہے کہ ٹھہرنا مشکل ہے۔ لوگ ایک عجیب تجسس لے کر وہاں جاتے ہیں اور پھر اس طرح اور اتنی تیزی سے وہاں سے پلٹتے ہیں کہ شاید یہ بدبو آگ کی طرح لپٹ بن کر ان کے دامن سے نہ الجھ جائے۔

"ادھر سے سر نظر آ رہا ہے"۔ کسی نے جھک کر پٹریوں کے ڈھیر کے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

’’سفید قمیض بھی پہنے ہوئے ہے‘‘۔ کسی نے جانکاری میں اوراضافہ کیا۔

’’اے بھیا یہ دیش ہے نرک ہے نرک جب جس کو چاہا مارا اور پھینک دیا۔ دھر پکڑ بس تھانہ میں روپیہ اچھل دوارے انگریز لوگ بھی راج کر گئے ہیں لیکن ایسی حالت کبھی نہیں ہوئی تھی‘‘۔ جس نے یہ بات کہی ہے میں اسے پہچانتا ہوں اسے آج تک انگریزوں سے اچھا حاکم نہیں ملا۔ پھر وہ انگریزوں کی شان میں قصیدے پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اسی وقت گاڑی بھی آجاتی ہے۔ تب سے لوگ دوڑ کر پلیٹ فارم پر پہنچ جاتے ہیں۔ گاڑی چلی جاتی ہے اور پھر بھیڑ اکٹھی ہونے لگتی ہے۔ میرے پیچھے چند مسلمان عورتیں کھڑی ہیں۔ ایک دوسرے کو رازدارانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہیں ’’بہن یہ بیچارا کوئی مسلمان ہے۔ مال پتر کے ساتھ رات کو اترا ہوگا چاروں طرف تو ہندو ہیں مار کر پھینک دیا ہوگا‘‘۔

اب سب لوگوں کو جدھر سے لاش دکھائی دے رہی ہے دیکھ دے رہے ہیں۔ اس لئے کہ ایک موٹے تن وتوش کا آدمی آیا ہے وہ جھک کر دیکھ رہا ہے اور اٹھتے ہی کہتا ہے ’’یہ سب کام مسلمان غنڈوں کا ہے اپنے محلے میں مار کر بچنے کی غرض سے یہاں پھینک دیا ہے۔ اچھا ذرا لاش نکلنے دو پھر بتاتا ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ فضا کشیدہ ہونے لگتی ہے۔ چہروں پر خوف وہراس کی تہیں دبیز ہونے لگتی ہیں۔ اب دھیرے دھیرے پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میرے آگے شاید دو مسلمان لڑکے ہیں۔ ان میں سے ایک کہہ رہا ہے ’’چلو جلدی سے محلّہ میں خبردار کردیں یہ جن سنگھی فساد کرانا چاہتے ہیں حالانکہ اسے خود ہی مارا ہوگا۔

فساد کا خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے سینکڑوں مائیں اپنی اجڑی اجڑی گود لئے سینہ پیٹ رہی ہوں۔ سینکڑوں بہنیں بیوہ ہوگئی ہوں۔ ماؤں کے بچے یتیم ہوگئے ہوں۔ بوڑھے باپ جن کے بڑھاپے کی لاٹھیاں ٹوٹ چکی ہیں دکھوں کا ایک مسکن اپنے سینے میں دبائے خاموش ہوں۔

اب میں کلکتہ جانا چاہتا ہوں۔ میری طبیعت گھبرا رہی ہے لیکن مجھے بی اے کے فائنل امتحان میں بیٹھنا ہے۔ جانا ہی ہوگا گاڑی آتی ہے اور میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ سوار ہو جاتا ہوں۔ میں خاموش ہوں جو مسافر دور سے آرہے ہیں وہ میرے ساتھ سوار ہوئے لوگوں سے ’’کیا ہوا ہے‘‘ پوچھ رہے ہیں۔ شاید انہوں نے بھی بھیڑ دیکھ لی ہے۔ لاش کی کہانی دہرائی جاتی ہے۔ تبصرے ہوتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کمیونسٹوں نے کانگریسی ورکر کو مارا ہوگا۔ کوئی کہتا ہے نہیں کانگریسیوں نے ہی مارا ہوگا۔ نہیں مسلمانوں کا کام ہوگا۔ اس علاقے کے مسلمان غنڈے بہت سر چڑھ گئے ہیں۔ میں خاموشی سے سب کچھ سن رہا ہوں۔ کمپارٹمنٹ کی فضا مکدر ہو چکی ہے لیکن میں اطمینان سے ہوں اس لئے کہ انگریزوں کا دیا ہوا میرے جسم پر وہ لباس ہے جس میں میں صرف انسان دکھائی پڑتا ہوں۔ ہندو یا

مسلمان نہیں۔ اچانک میرے ہاتھوں سے اردو کی کتاب گر جاتی ہے اور کچھ لوگ مجھے عجیب نظروں سے گھورتے ہیں۔ میں سہم جاتا ہوں اور دوسرا اسٹیشن آتے ہی ڈبہ بدل دیتا ہوں۔

اس کمپارٹمنٹ میں کچھ مسلمان ہیں جو شاید اپنے کسی ساتھی کو ہوڑہ سے ٹرین میں سوار کرانے کے لئے جارہے ہیں۔ مجھے ان کی گفتگو سے یہی معلوم ہو رہا ہے میں ان کے قریب ہی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ وہ آپس میں آہستہ آہستہ بات کررہے ہیں۔ ’’بھیا میں گھر پہنچتے ہی آپ کو چٹھی لکھوں گا۔ آپ بھی جلد خط لکھئے گا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ فساد ہو جائے گا۔ دیکھئے اخبار میں تو کل آئے گا ہی‘‘۔

دوسرا کہتا ہے ’’ارے بابو اگر کوئی ہندو مرا ہوگا تب نہ موٹی موٹی سرخی چھپے گی ورنہ مسلمان ہوا تو بیچارا تو کوئی جانے گا بھی نہیں......اور ہاں......گاؤں پر بھی ہوشیار کردینا آج کل فساد جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا ہے‘‘۔

اب سیالدہ قریب ہے۔ تمام لوگ سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ گاڑی رکتی ہے۔ میں بھی جلدی جلدی گیٹ کی طرف بڑھتا ہوں تاکہ بس میں جگہ مل سکے۔ اب میں امتحان ہال میں ہوں لیکن میرا جی گھر کی طرف لگا ہوا ہے۔ جیسے تیسے امتحان ختم ہوتا ہے۔ میں جلد اسٹیشن آتا ہوں اور ٹرین میں سوار ہو جاتا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار گھروں کے جلنے عورتوں اور بچوں کی کرب آمیز چیخوں کا تصور ابھرتا ہے۔ آخر گاڑی کانکی نارہ اسٹیشن پر آکر رکتی ہے۔ تمام دکانیں کھلی ہوئی ہیں، میں اطمینان کی سانس لیتا ہوں کہ اب تک کچھ نہیں ہوا۔ میں ٹرین سے اتر کر پھرٹی اسٹال کی طرف آرہا ہوں۔ یکایک میں ٹھنک کر رک جاتا ہوں۔ قریب ہی کسی چیز کے گھسیٹنے کی آواز کے ساتھ بدبو بھی آئی ہے اب میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک مہتر ایک ادھ سڑی کتے کی لاش کو گھسیٹے جنگل کی سمت جارہا ہے لیکن اب یہاں لوگوں کی بھیڑ بالکل نہیں ہے۔ کوئی بھی تو یہ دیکھنے کے لئے نہیں رکا ہے کہ بدبو کس لاش کی تھی۔

اب میرا چہرہ بالکل آسودہ ہے کیوں کہ میرا دلی کرب کتے کی لاش کے ساتھ لپٹ کر جنگل کی طرف جاچکا ہے۔

لیکن میں سوچ رہا ہوں!

سچائی ہمیشہ نیچے دبی رہتی ہے اگر ہم تھوڑی سی تکلیف کر کے ہزاروں من لوہے کے نیچے دبی ہوئی سچائی کو نکال لیں تو ہر جگہ کتے ہی کی لاش نکلے گی آدمی کی نہیں۔

اب میں ٹی اسٹال پر ہوں اور قریب ہی ایک قلی کہہ رہا ہے ’’اچھا ہوا کتے کی لاش پھینکوا دی گئی۔ بدبو سے برا حال تھا‘‘۔

واقعی یہ سچ کہتا ہے کتے کی لاش کے ساتھ بدبو بھی یہاں سے ختم ہوگئی......لیکن وہ بدبو کیسے دور ہو سکتی ہے جو ہمارے اور آپ کے دلوں میں بس گئی ہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

غزلیات

کیسے سناؤں غم کی کہانی سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے کہہ جاؤ' حال کو ہے انکار بہت
آپ پشیماں آخر کیوں ہیں مجھ کو کچھ بھی یاد نہیں
کس کی محبت کیسی کہانی' کس سے کیا تھا پیار بہت
ٹوٹا ماضی کا آئینہ یادوں کی بکھری کرچیں
ذہن کے زخمی تلوے اب ہیں چلنے سے بیزار بہت
پو پھوٹے' پر کشتیِ دل تھی ورطۂ ظلمت ہی میں ابھی
یوں تو چلائے شب کے سمندر میں ہم نے پتوار بہت
بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت
ٹھٹھکا تو تھا پھر جانے کیا سوچ کے آگے بڑھتا گیا
پائے وفا میں یوں تو چبھے تھے تیری جفا کے خار بہت
ترکِ تعلق سے اک میرا دل ہی نہیں ہے کچھ زخمی
تیر ہوئے ہی ہوں گے تیرے سینے کے بھی پار بہت

نظروں کے تصادم پہ میں اک پل کو ہنسا تھا
اک عمر رلایا مجھے اک پل کی ہنسی نے
کیا جانیے کیوں تکتے رہے راہ کسی کی
آنے کا تو وعدہ بھی کیا تھا نہ کسی نے
مرجھا نہ سکا یاد کی شاخوں کا کوئی پھول
اتنا تو کیا ہے میری آنکھوں کی نمی نے
بھولا نہ تمہیں رو نہ سکا مر بھی نہ پایا
کچھ بھی تو گوارا نہ کیا میری خودی نے
صدیوں جو رہِ عقل میں گمراہ رہا ہے
اے راہ جنوں تجھ کو پکارا ہے اسی نے
خوابوں کے حسیں عکس تھے جس راہ میں عرشی
وہ راہ بدل دی ہے تصور کی ندی نے

☆☆

۲۲ فروری ۱۹۷۰ء کو مولانا آزاد کالج کے طرحی مشاعرے میں پڑھی گئی غزل ''شرمندہ کیا جوہر بالغ نظری نے''۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے میری پلکوں میں
کتنے تاج محل ڈوبیں گے پانی کی ان بوندوں میں
کب تک خواب بنے گا اے دل امیدوں کی چھاؤں گئی
دیکھ تو کیسا دن چڑھ آیا' دھوپ ہی دھوپ ہے راہوں میں
بحرِ غم دوراں میں اک اک چیز تمہاری پھینک دی میں نے
یاد مگر بن بیٹھی ساحل ڈوب سکی نہ موجوں میں
تم کو پایا' تم کو کھویا' بات انوکھی اس میں کیا ہے
پر وہ خوشبو چبھ جاتی ہے بس جو گئی ہے بانہوں میں
ارماں کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤ گے بہہ جاؤ گے اشکوں میں
سب کا دل ہے اپنا اپنا' درد ہے سب کا اپنا اپنا
اپنی کہانی کیوں لے بیٹھے عرشی ایسے لوگوں میں

مطبوعہ ''ماہنامہ صبح نو'' (پٹنہ) دسمبر ۱۹۶۹ء

دل دھڑکتا ہے سرِ شام خدا خیر کرے
کیا ہو اس رات کا انجام خدا خیر کرے
رات آدھی ہے سرِ میکدہ کیوں ہیں مدہوش
شیخ جی آپ یہ ہنگام خدا خیر کرے
مے کشی ہوگئی پختہ میری شاید کچھ اور
آج پھر ٹوٹ گیا جام خدا خیر کرے
اجنبی جیسی بھٹکتی ہے کوئی بھولی یاد
اُف ترے شہر کی یہ شام خدا خیرے کرے
خود کلامی میں سرِ بزم جنوں محو ہے آج
لے نہ بیٹھے یہ کوئی نام خدا خیر کرے

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چھا گیا میرے مقدر پہ اندھیرا اے دوست
تونے شانوں پہ جو گیسو کو بکھیرا اے دوست
یوں شب غم میں تری یاد دبے پا آئی
تیرگی سے ہو نمو جیسے سویرا اے دوست
میں تو خاموش تھا چپ رہ نہ سکے زخم کے لب
میں نے سمجھا ہے سدا تجھ کو مسیحا اے دوست
ایک شبنم ہی جہاں رات گئے روتی ہے
دل ہوا میرا مثالِ گلِ صحرا اے دوست
وہ نشاں اہل خرد کہتے ہیں جس کو منزل
نقش پا سے ہے جنوں کے وہ ہویدا اے دوست
کشتیِ زیست کو حاصل ہوئی گردابِ عمیق
بحر الفت میں ملا کس کو کنارا اے دوست
تیرے گیسو میری الجھن کے خطاوار نہیں
تونے ان کو تو کئی بار سنوارا اے دوست

لٹ گیا اب تو متاعِ غم تنہائی بھی
کس ادا سے تیری یادوں نے پکارا اے دوست
پھر یہ چرچا ہے وہ آئیں گے سر بزم وحید
چھٹ نہ جائے کہیں دامانِ شکیبا اے دوست

کس کے جنونِ شوق کا چرچا ابھی سے ہے
سمٹی ہوئی جو وسعت صحرا ابھی سے ہے
اب تو غم جہان ملے یا خوشی ملے
میرا جنون شوق شکیبا ابھی سے ہے
میت کو میرے فکر کفن اب نہیں رہا
مجھ کو غبارِ رہ پہ بھروسہ ابھی سے ہے
کس کو خبر کہ حشر میں کس پر ہو فیصلہ
ان کو تو دیکھئے کہ بہانا ابھی سے ہے
سن کر وفا کا نام وہ کچھ مضطرب سے ہیں
ان کو مگر جنون کا دعویٰ ابھی سے ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

طوفاں نہیں اٹھا ہے ابھی بحرِ عشق میں
کیوں آپ کو یہ فکر کنارا ابھی سے ہے
میں نے یہ کس سے وعدۂ عہد وفا کیا
جو بدگمانِ وعدۂ فردا ابھی سے ہے
پھر بات وہ جو سنگ' تیشہ تک آگئی
طوفاں رہِ حیات میں برپا ابھی سے ہے
آسودگی دل کی تمنا جو کی وحید
ہر سو غمِ جہاں کا بلاوا ابھی سے ہے

بچھڑی ہوئی ماں کے نام

اے سراپا یاس درد و غم چناری کی زمیں
آستانِ خاک پر تیری جھکاتا ہوں جبیں
تجھ میں اک مجبور بچے کی ہے ماں گوشہ نشیں
اُف چھلک جائے نہ میرے صبر کا پیالہ کہیں
گردشِ ایام نے چھوڑا نہیں کوئی نشاں
اے میری بچھڑی ہوئی ماں تجھ کو میں ڈھونڈھوں کہاں
سامنے ہلکی سی یہ ابھری زمیں ہے تیری قبر
خاک میں پنہاں تو جیسے ذہن میں صالح کے صبر
چھوڑکر مجھ کو تو آسودہ ہے مثل نامہ بر
آنسوؤں کے سیل پر اب تو بہت مشکل ہے جبر
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں تیرے پیار کی آغوش کو
گوش بر آواز ہوں اے مشفقہ کچھ تو کہو
اے چناری یاد ہے مجھ کو تیرا درسِ فنا
مونسِ غم نے یہیں باندھا تھا پیمانِ وفا
زندگی جو پاس درد و غم سے تھی ناآشنا
تو نے ورقِ غم سے کی تھی باب نو کی ابتدا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آہ تونے یہ نہ سوچا میں ہوں طفلِ ناتواں
رکھ دیا تھا ننھی جاں پہ رنج کا بارِ گراں
ساحلِ درگاوتی پر اُف یہ بگلوں کی قطار
جابجا بے چین موجوں پر ہیں نظریں کامگار
بھاگتی رکتی مچلتی کانپتی پانی کی دھار
لڑکھڑاتے سنگ ریزے زیست کے آئینہ دار
کاش میں بھی اک ندی ہوتا یونہی رہتا رواں
فکر دنیا سے گریزاں اپنی دھن میں شادماں
جھومتے ہلتے ہوا کے دوش پر یہ سبزہ زار
جنت الفردوس کے پرتو ہیں ہر سو لالہ زار
نے خزاں کی فکر نہ آسودۂ دورِ بہار
وقت کے سانچے میں ڈھل جانا ہی ہے ان کا شعار
کیوں ہوا انساں میں کیوں غم سے ہوں میں ہمکنار
کیوں ہوا احساسِ دل پہلو میں غم کے غمگسار
ننھی سی جاں تھی مری تیری متاعِ زندگی
روح کو تسکین کا ساماں تھی میری زندگی
تپ میں میرے نیند اڑ جاتی تھی تیری رات کو
ایک ساعت مجھ سے دوری تجھ پہ تھی ایک جانکنی
اے مری ماں دیکھ پھر تنہاں ہوں گھبراتا ہوں میں
اشک سے زخم جگر کو آہ پھر دھوتا ہوں میں
خامشی کا ہر طرف جب گونجتا ہے ارغنوں
اک طلسم کیف سے ملتا ہے تب دل کو سکوں

خود فراموشی کا خود پہ کرتا ہوں طاری فسوں
تا کہ تجھ کو اور رگِ جاں کے قریں میں کرسکوں
پھر تصور میں میں ہوتا ہوں تیری آغوش میں
سوچتا ہوں تا ابد آؤں نہ پھر سے ہوش میں
جب گھنیری شب میں سوجاتی ہے ساری کائنات
پھر مرے فکر و تصور کی ہے محور تیری ذات
اشک کے ایندھن سے روشن کرتا ہوں شمع حیات
پھر اسی ضو میں تیری تصویر سے کرتا ہوں بات
حالِ غم تو دیکھ اپنے گوہر پندار کی
جل گئیں ہوں جیسے تخلیقیں کسی فنکار کی
یاد ہے وہ دن تیرے پہلو میں تھی میرے نشست
ہاں یہ سچ ہے کہ ترے قدموں میں تھی میری بہشت
آج تجھ بن راہِ ہستی پر پڑا ہوں مثلِ خشت
بجھ چکا ہے شعلۂ دل اور ہے ویران کشت
رب کے وعدۂ جنا پر کس طرح ہو اعتبار
مادرِ فردوس زاہوں چھیننا جس کا شعار
اے دلِ درد آشنا کیوں ہے خدا سے بدگماں
سورۂ قرآن شاہد ہے کہ رب دوجہاں
وہ نہیں بیٹا کسی کا اور نہ کوئی اس کی ماں
پھر تیرا حالِ غم دل اس پہ ہو کیونکر عیاں
آفتابِ چرخ کیا جانے ادائے دلبری
جانتی ہے شمع پروانے جلے یا خود جلی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گمنام پھول

توڑ لے توڑ لے اب دیر نہ کر
دھول اپنی بھی نہ قسمت ہو کہیں
اوس سے بھیگی ہوئی آخر شب
صبح کا میں نے بھی پیغام سنا
جس سے مجھ کو بھی ملا ذوق نمو
صبح کے لمس نے مجھ کو بھی حرارت بخشی
اولیں کرنوں نے مجھ کو بھی دیا اذنِ حیات
غلبۂ شوق سے کھل اٹھا میں ہنگام سحر
آ! کہ اب توڑ بھی لے دیر نہ کر
دھول اپنی بھی نہ قسمت ہو کہیں
خودرو گمنام کسی پودے کی تخلیق ہوں میں
پیرہن میرا معطر نہ شناسا مرا نام
پر کشش رنگ ہے میرا نہ ہے دل کش مرا روپ
مجھ میں سوسن کی پھبن ہے نہ گلابوں کی مہک
وصف بیلے کا نہیں حسن بھی لالہ کا نہیں
موتیا موگرا یا ریحان کی خوبی بھی نہیں

urdukutabkhanapk.blogspot.com

مجھ میں کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہ سہی پھول تو ہوں
توڑ لے توڑ بھی لے دیر نہ کر
دھول اپنی بھی نہ قسمت ہو کہیں
ہار بن جاؤں گلے کا یہ تمنا بھی نہیں
زلف میں تیری جگہ پاؤں یہ حسرت بھی نہیں
مجھ کو پوجا کے لئے چن لے یہ چاہت بھی نہیں
بس یہ خواہش ہے مری ——
زندگی اب جو ملی تو غم ہستی بھی ملے
اس سے محروم نہ کر
توڑ لے توڑ لے اب دیر نہ کر
دھول اپنی بھی نہ قسمت ہو کہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تجلی

ختم پھر ہونے کو ہے ہنگام روز
حزن واضمحلال کے روزن سے پھر جھانکی ہے شام
یادِ ماضی کے شکستہ طاق پر شمع حیات
اشک کے ایندھن سے پھر ہوگا فروز
پھر وہیں!!!
جھلملاتی سیم گوں پرچھائیوں کے درمیاں
باندھ کر پاؤں میں پایل یاد کی کچھ اپسرائیں
زیست کے آنگن میں ہوں گی محوِ رقص
جن کے نقش پا پہ ہوگا ماہ وانجم کا گماں
لحن داؤدی سے پھر پھیلے گا بے پایاں فسوں
جن کی آنکھوں سے چھلک جائے گا بادۂ بطوع
اُف مگر یہ سب غم دوراں سے دے پائیں گے نہ دل کو سکوں
پھر سلگتی خاموشی میں دردِ دل کا کارواں
اک جہاں سکتہ بداماں اور گمراہی نصیب
اس طرح کچھ ہوگا لرزیدہ کہ جیسے
زورِ طوفاں سے کوئی کومل کلی

ٹوٹ کر اٹکی ہو نوکِ خار پر
!ـــــــ
پھر شکستہ حسرتوں کے خار پر
سرنگوں بیٹھے گا بے حاصل شباب
اور پھر
فیل آسا کو ہسارِ غم پہ ضوا امید کی
اک حقارت اور استہزا رموز
جیسے روئے مہ وشاں پہ داغ برص
اور پھر!!
اس تخیل کی صحن میں رقص کرتی اپسرائیں
تھک چکیں گی آخرش
اور تھکے قدموں کی آہٹ بھی یہیں پر ہوگی ختم
پھر طیوروں کے لحن سے جاگے گی اک صبح نو
اک تجلی..........!!!!اک کرن امید کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اقلیت

یہ کیا ہیں؟
زیرو پاور کی عینک
چاہے جس پارٹی کی آنکھ پہ رکھ دو
دھوپ، دھول
سے تو محفوظ یہ کر سکتے ہیں
لیکن اس کی بینائی پر
بوجھ پڑے
یا اس کے انداز نظر میں
فرق آئے
ناممکن ہے

urdukutabkhanapk.blogspot.com

فساد

آؤ ساتھی!
تم مسجد سے لاؤ مصلیٰ
ہم مندر سے مورت لائیں
دونوں مل کر
جنم جنم کے ان جھگڑوں کو ختم کر دیں
وہ مندر سے لایا مورت
وہ مسجد سے لایا مصلیٰ
پھر دونوں نے عہد کیا
جنم جنم کے ان جھگڑوں کو آج مٹا کر دم لیں گے
آج دلوں کے بیچ کی ہر دیوار ہٹا کر دم لیں گے
آؤ ساتھی آؤ ان کو ختم کریں
اور پھر!
ایک نے کہا!
آؤ ان دونوں کو جلا دیں
دوسرے نے کہا
نہیں!
ان دونوں کو دفن کریں
فساد! ـــــ فساد!

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

عورت

ڈسکشن میز پر
خلوت میں
جلوت میں
اندھیری کوٹھیوں میں
جگمگاتی شاہراہوں پر
بہن، ماں، بیٹی، بیوی اور محبوبہ کی شکلوں میں
نہ جانے کتنی صدیوں سے
میں ہر اک روپ اس کا دیکھتا ہوں
آج بھی ـــــ
لیکن!
یہی محسوس ہوتا ہے
کہ اب تک تشنگی میرے نگاہ و دل کی باقی ہے

درد

جب کبھی آخر شب
چاند کا داغ ٹپکتا ہے لہو بن بن کے
جب کبھی نجمِ سحر
جھلملاتے ہیں کسی آنکھ میں آنسو بن کے
جب کبھی تپتی کرن
بوسے لے لے کے جھلس دیتی ہے کلیوں کے
تب
اسی وقت
بھٹکتا ہوا افتاں، خیزاں
ایک انجانا سا درد آتا ہے
اور بن جاتا ہے احساس کے دامن کی شکن

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

منظر پس منظر

''بندے ماترم''
''گاندھی اور نہرو کی جئے ہو''
''رام راج ہو''
''اکھنڈ بھارت''
''بھارتیہ کرن ہو سب کا''
''نعرۂ تکبیر''
''آمرا بنگالی''
''جئے آندھرا''
''ہندی لاؤ''
''ہندی ہٹاؤ''
''تامل تیلگو بنگلہ بچاؤ''
''ہنسوا ہتھوڑا تارا''
''ہنسوا دھان کی بالی''
''بھارت کے مزدور کے منہ کی لالی''
''گنتنتر اور سوشلزم کی جئے جئے کار''
''لینن مارکس ماؤ اور ہوچی منہ کو لال سلام''
''سی آئی اے بھارت سے ہاتھ اٹھاؤ''
''بورژوا اور سامراجی کتے مردہ باد''

ہوا میں لہراتے بازو
پھولی ہوئی رگیں گردن کی
لمبی قطاریں شور شرابہ چپہ چپہ
ان نعروں کا جوش دیکھ کر اکثر میں نے سوچا ہے
امریکی گیہوں میں کتنی طاقت ہے

غیر مطبوعہ نظم رہگزر

رہ گزر ہی رہ گزر رہی، جدھر جدھر گئے
دائرے کی طرح ہم بنے، بڑھے، بکھر گئے
سیل کی طرح کبھی جو تیری سمت ہم بڑھے
پاؤں چومنے لگے سمٹ سمٹ کے فاصلے
پھر نہ جانے کیا ہوا کہ خود ہی ہم ٹھہر گئے

....

فکر کی وہ دھوپ تھی کہ روح تک جھلس گئی
سر برہنہ یاد تیری چھاؤں کو ترس گئی
چاہ تھی کہ راہ میں گھنا کوئی شجر ملے

....

جانے کس کی آرزو تھی جانے کس کا انتظار
جانے کس کی یاد کی تپش سے دل تھا بے قرار
پھر یہ کیسی آرزو کہ کوئی ہم سفر ملے

....

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مرہم

کٹ گیا میرا ہاتھ اچانک
ڈیٹول، بورک، ٹنکچر، آیوڈین
اور نہ جانے کیا کیا مرہم
لگا چکا میں
لیکن زخم ابھی تازہ ہے
درد ابھی باقی ہے
کل اسٹیشن پر یہ دیکھا
ایک بھکارن کی چھوٹی سی بچی
ننھے گندے پاؤں کے حلقے میں
دو کوزے، التا کی خالی شیشی
رنگ، برنگے ٹوٹے پلاسٹک کے ٹکڑے
اور ہونٹوں پر اک انجانا گیت سجائے کھیل رہی تھی
پھر اک بوٹ سے نہ جانے کیسے
اس کے گندے پاؤں کی انگلی کچل گئی

چیخ پڑی وہ ـــــــ
رو رو پاؤں ٹپک ٹپک کر زخم کو وہ سہلاتی رہی
لیکن زخم ابھی تازہ تھا
درد ابھی باقی تھا
پھر وہ بچی اٹھ کر
اتنے زور سے، اتنے آہستہ سے بولی
کہ وہ جس نے اس کا پاؤں تھا کچلا
سن بھی لے، سن بھی نہ سکے
''حرامی''
یہ کہہ کر کہ الٹی ہتھیلی سے آنسو بھی پونچھ لئے
پھر وہ مگن تھی کھیل میں اپنے پہلے سی آسودہ
اپنے زخم کو دیکھ کے میں اب کھڑا کھڑا یہ سوچ رہا تھا
درد کے کیا کیا مرہم ہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اداس خواب

وحید عرشی

کہیں نہ نیند کی وادی نہ خواب کے سائے
یہ راہ فکر کی کس دشت سے گزرتی ہے
اداس خواب بھٹکتے ہیں دور آنکھوں سے
تمام رات خیالوں کی دھول اڑتی ہے

حوالہ جات

لمعات	سالانہ ادبی مجلّہ، حاجی نگر، ایڈیٹر ناصر علی انصاری
اخبارِ مشرق، کلکتہ	مورخہ ۶/فروری ۱۹۸۶ء
مغربی بنگال	یکم/مئی ۱۹۸۶ء، جلد ۳۳ شمارہ ۹
پاسبان (بنگلور)	یکم/جولائی ۱۹۹۶ء
عکس و نقش	مصنف زماں قاسمی - صفحہ نمبر ۵۴
یادوں کا زنداں	مرتب: کمال جعفری
دستک - ۵	ایڈیٹر عنبر شمیم - صفحہ ۱۲۷
تحریریں بولتی ہیں	محمد شمشیر عالم - صفحہ ۶۴
قرطاس و قلم	دوسرا سالانہ مجلّہ ۲۰۱۱ء، یاڈیٹر: احمد کمال حشمی
راشٹریہ سہارا، کلکتہ	مورخہ ۲۲/فروری ۲۰۰۹ء
اخبارِ مشرق کلکتہ	۷/مارچ ۲۰۰۴ء
آبشار، کلکتہ	۲۰/فروری ۱۹۹۲ء
میری آواز سنو	نور اقبال - صفحہ ۵۲
بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء	مشتاق احمد - صفحہ ۳۰۹
کرن	حمایت الغرباء ہائی اسکول میگزین ۱۹۸۶ء
صدف	سیون اسٹار کلب، جگتدل سالانہ مجلّہ ۱۹۸۶ء
غزل کی رات	ادبی مجلّہ، کانکی نارہ ۱۹۷۷ء
اختر ثاقب	مرتب شہود عالم آفاقی، ۱۹۷۵ء
رقص تصور	محمد قاسم انصاری، ۳/کانکی نارہ، ہولڈنگ ۳۲
آئینہ	ایوانِ اردو مجلّہ، کمرہٹی - ۱۹۸۵ء
سمط، کلکتہ	جلد ۴، شمارہ ۱۱، صفحہ ۱۸

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قلم کاروں کا مختصر تعارف

مظہر امام: سی ایم او ہائی اسکول سے درس وتدریس کا آغاز۔ ریڈیو اور دوردشن کے منسلک۔ تقریباً نصف درجن کتابوں کے مصنف۔ زخم تمنا‘ رشتہ گونگے سفر کا‘ پچھلے موسم کا پھول‘ اکثر یاد آتے ہیں‘ آتی جاتی لہریں‘ آزاد غزل کا منظر نامہ (طویل مضمون)۔

معین اعجاز: ادبی زندگی کا آغاز کلکتہ سے۔ صحافتی زندگی دہلی میں آکاش وانی (نئی دہلی) اردو سروس سے وابستہ۔ طنزومزاح بھی لکھتے ہیں۔ وحید عرشی کے حلقہ احباب سے تعلق۔

کمال جعفری: آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پروگرام ایگزیکیٹو۔ معروف ادیب و شاعر‘ تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یادوں کا زنداں‘ لوح محفوظ‘ ذکر محفوظ۔

جاوید ارشد چودھری: کلکتہ یونیورسٹی سے اردو غزل پر ڈاکٹر مظفر حنفی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ ’’آزاد کے بعد مغربی بنگال میں اردو غزل‘‘ مکمل کیا۔ دستک-۵ (ہوڑہ) ایڈیٹر عنبر شمیم اسی کی یادگار رہے۔

پروفیسر حیدر صفت: جدید شاعر اور نثر نگار۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستگی رہ چکی ہے۔ وحید عرشی کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔

پروفیسر شاهد اختر: وحید عرشی کے خاص شاگروں میں شمار ہوتا ہے۔ صدر شعبۂ اردو ہگلی محسن پوسٹ گریجویٹ کالج چلتے ہوئے تو چمن کو چلیئے (سفرنامہ) کے مصنف‘ سہرا سر کو ہسار کے مرتب‘ ماہ نامہ نوائے حبیب اور مجلّہ ہگلی محسن کالج (پروفیسر اسدالزماں کی سبکدوشی پر) کے ایڈیٹر‘ کے علاوہ متعدد ادبی مضامین اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

زماں قاسمی: وحید عرشی کے برادر کبیر پروفیسر مجیب الحق سے گہرے تعلقات تھے۔ شاعر‘ ادیب‘ شطرنج کے کامیاب کھلاڑی۔ تین کتابوں کے مصنف۔ ریت اڑتی رہی (شعری مجموعہ)۔ عکس ونقش (ادبی‘ تحقیقاتی‘ تاثراتی مضامین کا مجموعہ)۔ شکر اللہ کا (سفرنامہ حج بیت اللہ ۲۰۰۹ء)۔

منور رانا: صاحب طرز ادیب‘ نئی نسل کے نمائندہ شاعر‘ مشاعروں کے کامیاب نقیب‘ درجن بھر کتابوں کے مصنف۔ نیم کا پھول‘ بغیر نقشے کا مکان‘ کہو ظل الٰہی سے‘ چہرے یاد رہتے ہیں‘ غزل گاؤں‘ مور پاؤں‘ پیپل چھاؤں۔ وحید عرشی کے عقیدت مندوں میں ہیں۔

ابراهیم ناشاد: ابراہیم ناشاد کا تعلق کانکی نارہ سے تھا۔ بعد میں کھلنا چلے گئے۔ وحید عرشی سے دوستانہ مراسم تھے۔

دل عرفانی: کانکی نارہ کے مستند شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وحید عرشی کے حلقہ احباب میں شامل۔

نور اقبال: مدرس رہ چکے ہیں۔ نظموں کے کامیاب شاعر ہیں۔ کئی کتابیں (کتابچے) منظر عام پر آچکی ہیں۔ جھرنا‘ ہم آزاد ہیں‘ میری آواز سنو‘ میں راہی پریت کی راہوں کا۔

ہمدم نعمانی: بانی شعبۂ اردو بھیرب گنگولی کالج بیل گھڑیا‘ ۱۹۸۰ء کے بعد کی نسل کے نمائندہ شاعر‘ عمدہ نثر نگار اور کامیاب مدرس۔

ڈاکٹر عظیم اللہ هاشمی: تعلیمی ادارے سے منسلک۔ اپنا تحقیقی مقالہ زیر نگرانی ڈاکٹر عبدالمنان مکمل کیا۔ نثری مضامین کا مضمون ’’ادبی اُفق‘‘ کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ افسانہ نگاری میں اخبارِ مشرق (کلکتہ) کی جانب سے انعام یافتہ۔

ڈاکٹر افضال عاقل: نوجوان شاعر و ادیب۔ آیاتِ سخن کے مرتبین میں شامل۔ بھیرب گنگولی کالج میں اردو کے استاد۔ منظر عام پر درج ذیل کتابیں آچکی ہیں۔

(۱) انحراف واعتراف (نثری مضامین)

(۲) کچھ بیاں اپنا (نثری مضمون)

(۳) اشک ریز (شعری مجموعہ)

محمد شمس الزماں انصاری: صدر مدرس چشمہ رحمت پرائمری اسکول۔ نارتھ چوبیس پرگنہ ڈسٹرکٹ مومن کانفرنس کے سکریٹری‘ پرائمری اساتذہ کی یونین‘ بارکپور ڈویژن کے سکریٹری۔ وحید عرشی کے حلقہ احباب میں شامل۔

محمد ایوب انصاری: سابق ہیڈ ماسٹر خضر پور ہائی اسکول۔ فی الحال شمس اردو ہائی اسکول کے معاون مدرس۔ اردو ادب اور انگریزی ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ گاہے گاہے ادبی مضامین اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔

احمد وکیل علیمی: کلکتہ میونسپل کارپوریشن اسکول کے مدرس۔ معروف ادیب و شاعر۔ بیشتر ادبی مضامین اخبارات ورسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔

معید رشیدی: نوجوان شاعر‘ ادیب اور نمایاں تنقیدی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اکثر وبیشتر تنقیدی مضامین ملک کے موقر جرائد کی زینت بنتے ہیں۔ علامہ رضا علی وحشت پر ایک مبسوط کتاب شائع ہو چکی ہے۔ فی الحال جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی سے ایم اے (اردو) کرنے کے بعد ایم-فل کررہے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وحید عرشی تصاویر کے حوالے سے

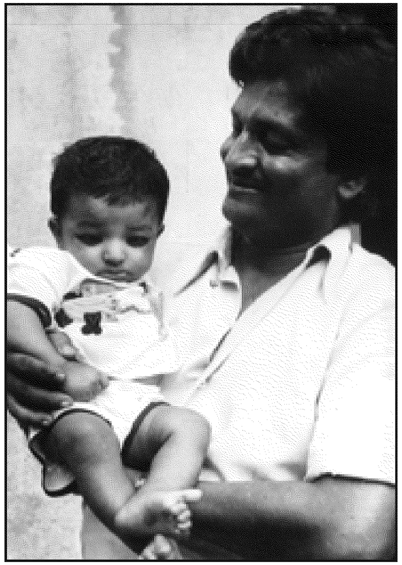

وحید عرشی اپنے بڑے بیٹے دانش کے ساتھ

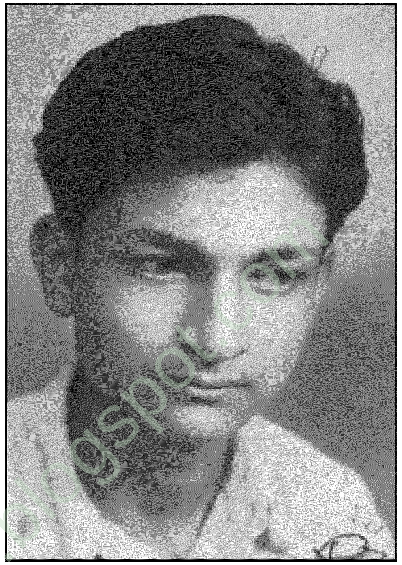

نوعمر وحید عرشی

مرزا غالب پر منعقدہ ڈرامے میں وحید عرشی غالب کا کردار ادا کرتے ہوئے

وحید عرشی مسجد ربانی، سیالدہ کے پاس

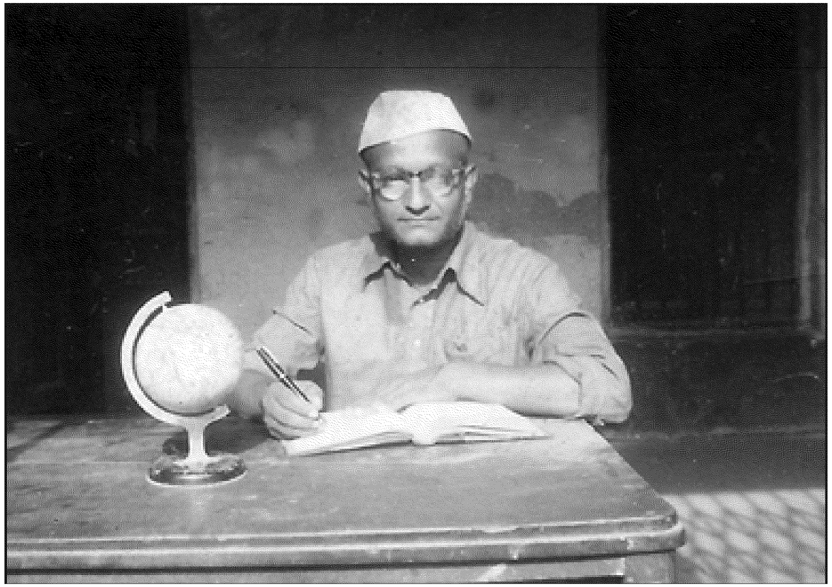

وحید عرشی کے والد محترم مولوی محمد حنیف

وحید عرشی اپنے خسر ڈاکٹر عبدالرؤف کے ساتھ جن کی گود میں ان کے فرزند دانش اریب کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

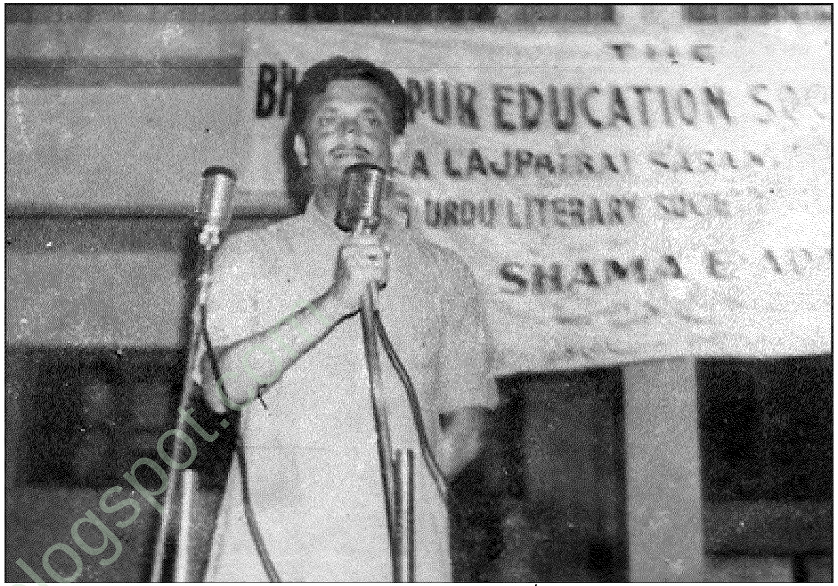

بھوانی پور کالج کے مشاعرے میں کلام پڑھتے ہوئے۔

چندن نگر کے ایک مشاعرے میں کلام پڑھتے ہوئے۔

وحید عرشی کی دست کاری کے نمونے

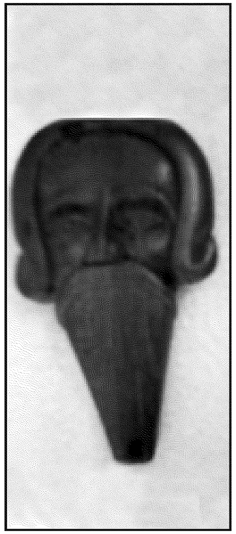

لکڑی پر بنائی گئی رابندر ناتھ ٹیگور کی تصاویر

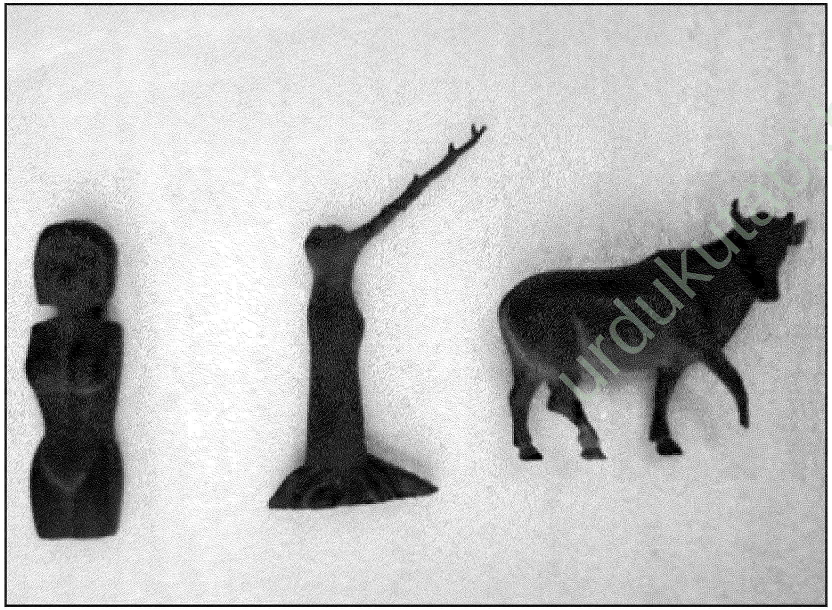

لکڑی پر بنائی گئی مختلف تصاویر

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لکڑی پر بنائی گئی غالب کی تصویر

وحید عرشی کی صاحب زادی شاذیہ وحید کی بنائی ہوئی اپنے والد کی تصویر

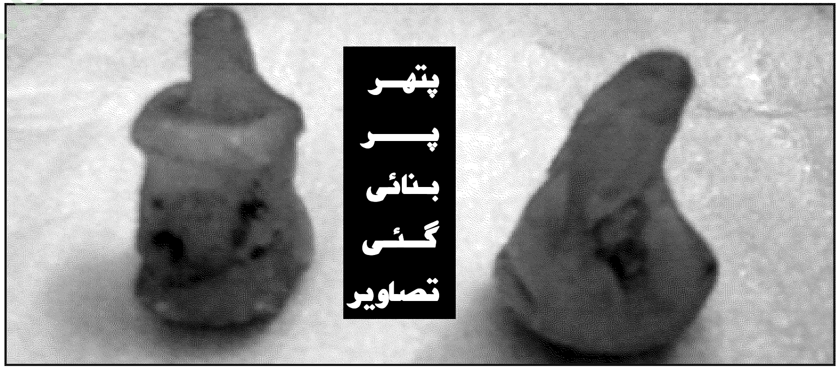

پتھر پر بنائی گئی تصاویر

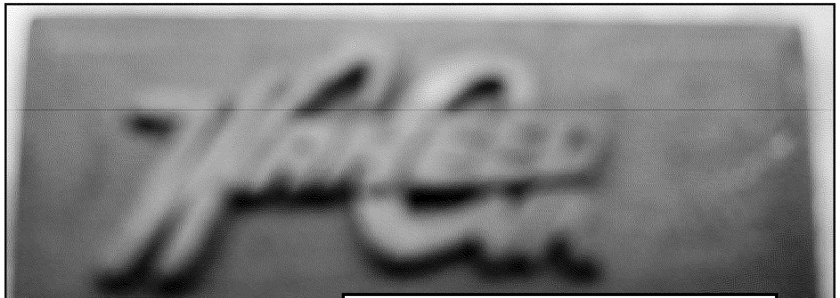

وحید عرشی کے دستخط کا ایک نمونہ لکڑی پر

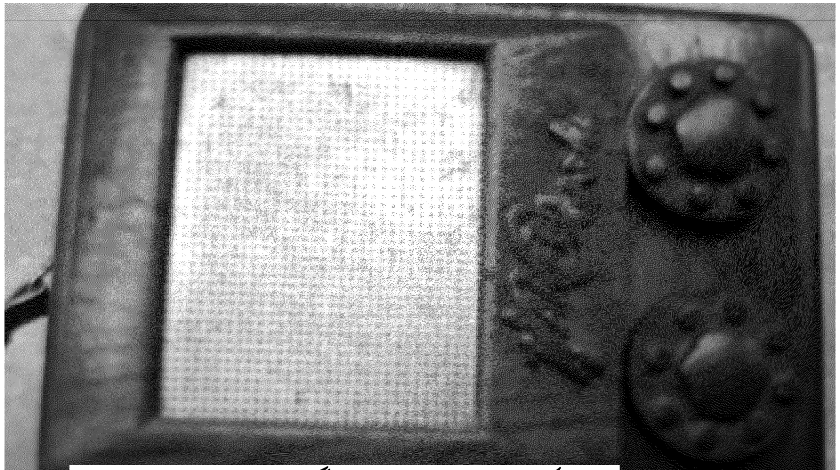

لکڑی پر بنایا ہوا ریڈیو کا نقشہ انگریزی دستخط کے ساتھ

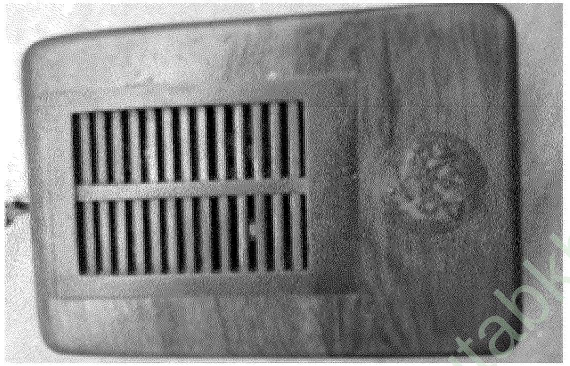

لکڑی پر ریڈیو کا نقشہ دستخط کے ساتھ

وحید عرشی کا دستخط مع تاریخ

لکڑی پر بنایا ہوا ریڈیو کا نقشہ دستخط کے ساتھ

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اردو دوست لائبریری

اردو دوست ڈاٹ کوم

www.urdudost.com

urdukutabkhanapk.blogspot.com